
ی احمد مدنی کی
مدرّس

شایان احمد مدنی

کی

معذرتیں

ناشران

شامی پبلی کیشنز
۱/۸ - احاطہ مرکزی تار گھر، چندریگر روڈ،
کراچی

طابع ـــــــــ الف۔ الف۔ شامی

ناشر ـــــــــ شامی پبلی کیشنز
احاطہ مرکزی تار گھر، چندریگر روڈ کراچی

مطبع ـــــــــ ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس
پاکستان چوک۔ کراچی

اشاعت ـــــــــ ایک ہزار

قیمت: ۳.۵۰ روپے

ترتیب

تعارف

شایان احمد مدنی دورِ حاضر کے خاصے معروف ادیب ہیں۔ اس لحاظ سے کسی خاص تعارف کے محتاج نہیں۔ پھر بھی تفصیل کے اجمال کے طور پر حالاتِ زندگی اور ادبی روش پر قدرے روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

پیدائش آپ کی بمقام دہرہ دون صوبجات متحدہ ۲۳ ستمبر ۱۹۴۵ء کو ہوئی اور ابتدائی تعلیم اسلامیہ کالج بریلی میں پائی۔ پاکستان میں ورود ۱۹۵۸ء میں ہوا۔

لکھنے کا شوق اس عمر سے تھا جب کہ آپ کو ابھی نہ لکھنا آتا تھا اور نہ پڑھنا۔ اپنی بڑی ہمشیرہ سے مضامین سن کر کتب بینی کا شوق پورا ہونا اور بڑے بھائی کو مضامین لکھا کر مضمون نگاری کا۔ یہ دور غیر مطبوعہ

مضامین کا تھا۔

۱۹۵۶ء میں پہلی بار آپ کی ایک کہانی بچوں کے ایک رسالہ "پروانۂ خدمت" میرٹھ میں شائع ہوئی۔ کئی سال تک بچوں کے لئے لکھا کھلونا، پھلواری اور جنگ نونہال لیگ کے باقاعدہ لکھنے والوں میں شامل رہے۔

پہلا مزاحیہ مضمون "حکیم صاحب کا ٹیلی فون" نمکدان کراچی میں ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد سے ادبی رسالوں میں باقاعدہ لکھتے رہے۔ ادب لطیف، ادبی دنیا، نیرنگ خیال، جام نو، اخبار جہاں، اخبار خواتین، چلمن وغیرہ میں مضامین شائع ہوتے رہے۔ ڈائجسٹوں میں صرف اردو ڈائجسٹ اور سیارہ ڈائجسٹ ہی کو ڈائجسٹ تصور کرتے ہیں اور انہیں کے لئے لکھتے ہیں۔

تحریر آپ کی شستہ طنز اور لطیف مزاح کے امتزاج سے عبارت ہوتی ہے۔ افراد اور طبقات کی تضحیک سے حتی الامکان پہلو بچاتے ہیں۔ مضامین میں مکالماتی انداز بیان کو ترجیح دیتے ہیں۔ موضوع کا افادی پہلو اجاگر کرنے کے سلسلے میں اگر مزاح پس پشت ڈالنا پڑے تب بھی اس کی روح کو برقرار رکھتے ہیں۔ خالص مزاحیہ مضامین بہت کم ہیں۔

مضامین میں عموماً معاشرے کی ظاہری اور باطنی بدعنوانیوں کا

پردہ چاک کرتے ہیں مقصد اصلاح ہوتا ہے نہ کہ تضحیک۔ قومیت کا تشخص آپ کے اکثر مضامین کا بنیادی تصور رہا ہے۔ قومی لباس، زبان، طرزِ فکر، معاشرت، معیشت پر مضامین لکھے ہیں جن کی افادیت مسلم ہے۔"

(ادارہ)

دیباچہ

ہماری بھی سُنیئے!

پطرس مرحوم فرماتے ہیں "اگر آپ کو یہ کتاب کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر آپ نے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اگر آپ نے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے" میں کہتا ہوں آپ نے یہ کتاب خواہ کسی طرح بھی حاصل کر کے پڑھی ہے تو مجھ پر احسان نہیں، احسان عظیم کیا ہے۔ کیونکہ یہ پطرس مرحوم کا دور نہیں ہے۔ اس تیز رفتار میکانکی اور 'بے ادبی' کے دور میں اگر آپ نے، اس کتاب کے لئے تھوڑا سا وقت نکال لیا ہے تو میں اسے اپنے اوپر احسان عظیم کیوں نہ کہوں جب کہ میں جانتا ہوں کہ آپ اپنا یہی وقت کسی چمکیلے بھڑکیلے محیر العقول اور سنسنی خیز واقعات سے بھر پور ڈائجسٹ پر بھی صرف کر سکتے تھے۔ میں ایک عرصہ سے ادبی اور نیم ادبی رسائل میں لکھ رہا ہوں —— ممکن ہے آپ میں سے بیشتر ایسے خوش نصیب بھی ہوں جو میرے نام سے

واقف نہ ہوں۔ اگر انہوں نے پڑھنے کے لئے میری کتاب منتخب کی ہے تو میں اسے اپنی خوش نصیبی تصور کروں گا۔ اگر یہ کتاب پڑھ کے انہیں وقت ضائع ہونے کا احساس ہو گا تو میں معذرت طلب کرتا ہوں۔

اب آیئے اس حماقت کی طرف، یعنی مجموعۂ مضامین شائع کرنے کی حماقت — مجھے اس حماقت پر اکسانے والے خیار یارانِ طریقت ہیں جن کا خیال ہے کہ شاعر اپنے دیوان کے بغیر مکمل شاعر — اور کوئی ادیب اپنے ناول یا افسانوں کے مجموعہ کے بغیر مکمل ادیب نہیں قرار دیا جا سکتا۔ لہٰذا اگر میں فوراً اس حماقت کا مرتکب نہ ہوا تو ادب میں کتنے تیں کا منیڈک نبار ہوں گا۔ الغرض انہوں نے کچھ ایسا تاؤ دلایا کہ اس پر تیار ہونا پڑا۔ اب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے — کیا میں کیا میری بساط۔ ادبی دنیا میں جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے کہ یہ جرأت — کہیں اسے خودنمائی نہ سمجھ لیا جائے —؟ بہرحال میں اپنی اس حماقت پر نادم ہوں۔

معذرتیں — یہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ کچھ مضامین مختلف رسائل سے لئے گئے ہیں اور کچھ فائلوں میں سے ملے ہیں جنہیں لکھ کر بھول چکا تھا اور مضامین کی جستجو کے دوران ہاتھ لگے۔ کچھ بھلے معلوم ہوئے اور شامل کر لئے گئے — ہاں ایک بات۔ مضامین پڑھنے کے بعد نیچے درج شدہ سن پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے

تاکہ آپ کسی الجھن کا شکار نہ ہونے پائیں۔

ایک وضاحت اور وہ یہ کہ مرزا صاحب ایک کردار ضرور ہے مگر یہ کوئی مخصوص کردار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں یہ کردار ہر فن مولا نظر آئے گا اور کہیں اس میں کمزوریاں دکھائی دیں گی۔ بعض جگہ اس کردار کو انسانی کمزوریاں اور کوتاہیاں منظر عام پر لانے کے لیے بطور "چارہ" استعمال کیا گیا ہے اور بعض مقام پر یہ خود معاشرے کی برائیوں اور بدعنوانیوں کا پردہ چاک کرتا نظر آئے گا لہٰذا مختلف مقامات پر اس کے عادات و خصائل کے تضاد پر چونکنا نہیں چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہیں مرزا نوشہ بیگ کا ذکر خیر ہو اور کہیں صولت مرزا سرگرم عمل رہے ہوں۔

آخر میں میں ان تمام حضرات کا از حد ممنون ہوں جنہوں نے اس مرحلہ کو تکمیل تک پہنچانے میں میری قدم قدم پر مدد کی اور کئی معاملات میں مفید مشورے دے کر میری نااہلی کی پردہ پوشی کی۔ اس کے باوجود اگر کتاب میں کوئی فنی سقم نظر آئے تو اسے میری ناتجربہ کاری پر محمول کر کے معاف کر دیجیے گا۔

والسلام

[signature]

۱۸/۱۱/۷۲

سیاست دانوں سے معذرت کے ساتھ

- مرزا صاحب کی سیاست
- مرزا صاحب اور الکشن

مرزا صاحب کی سیاست

مرزا صاحب کی متلون مزاجی نے انہیں ہمیشہ نقصان پہنچایا تھا۔ گھر والے تو الگ رہے، دوست احباب تک ان کی ڈانواں ڈول طبیعت سے پریشان تھے۔ کسی جگہ جم کر کام کرنا تو سیکھا ہی نہیں تھا میرے یار نے۔ آئے دن ملازمتیں بدلتے رہتے۔ اس پر بھی موقوف نہیں، بعض اوقات یہ ملازمت بھی انہیں کاٹنے کو دوڑتی اور طبیعت تجارت کی طرف مائل نظر آنے لگتی۔ چنانچہ "تجارت" شروع کر دیتے۔ مگر کتنے عرصے؟ یہاں سے بھی طبیعت اکتانے لگتی اور انہیں دوبارہ کسی دفتر میں فائلوں کے اندر پناہ ڈھونڈھنی پڑتی۔ ایک دفعہ نہ جانے کیا سوجھی کہ "اسپورٹس مین" بننے کی تیاری کرنے لگے۔ صبح کو اٹھ کر کھلاڑیوں کی مخصوص ورزش کرتے، پھر مختلف فاصلوں کی دوڑیں لگاتے۔

ریکارڈوں کی دوڑیں، سو میٹر کی دوڑ، دو سو میٹر کی دوڑ، اس کے علاوہ ہائی جمپ اور لانگ جمپ کی مشق بھی کرتے۔ بہت ٹٹولنے پر معلوم ہوا کہ حضرت کو یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ ہمارا ملک اولمپک میں کوئی نمایاں مقام حاصل کیوں نہیں کرتا۔ ہمارے کھلاڑیوں میں کیا کمی ہے جو دوڑ بھاگ، اچھل کود میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر پاتے ان کا عزم تھا کہ وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک دو ایک عالمی ریکارڈ نہ توڑ ڈالیں، مگر ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی اور اس کی وجہ ان کی متلون مزاجی نہیں، بلکہ ایک حادثہ ہوا۔ کودنے کی مشق کے دوران ایسے بے ڈھب گرے کہ ایک ہفتہ تک اسپتال میں پڑے رہے۔ اسپتال سے جو باہر آئے، تو پھر کسی دفتر میں جا پہنچے کیونکہ اس دوران میں سپورٹس مین بننے کا عزم سرد پڑ چکا تھا۔

ایک بار اطلاع ملی کہ مرزا صاحب سیاست میں حصہ لینے کے لئے پر تول رہے ہیں۔ یہ خبر سن کر ہم ہکا بکا رہ گئے، مرزا صاحب اور سیاست — عجیب مضحکہ خیز بات تھی اور ساتھ ہی تشویشناک بھی۔ سیاست کے میدان میں پہلوانوں کے اکھاڑے سے زیادہ خطرناک اور اوچھے داؤں پیچ آزمائے جا رہے تھے، جہاں سے ہڈی پسلی بچا کر نکلنا مشکل تھا۔ مرزا صاحب کے ہمدرد اور دوست ہونے کے ناتے ہم ہم انہیں اس ارادے سے باز رہنے کی تلقین کرنے ان کے گھر جا پہنچے۔ تو دیکھا کہ حضرت لنگوٹ کسے لیٹے ہیں اور ایک پہلوان نما آدمی ان کے جسم کی مالش کر رہا ہے۔ ہمیں دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے:

"آؤ بھئی نجمی آؤ، تمہیں شاید ہمارے نئے پروگرام کی اطلاع مل گئی ہوگی یہ سب اسی سلسلہ کی ابتدائی کڑیوں میں سے ایک ہے۔"

"مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ مرزا صاحب۔۔۔۔ یہ آپ کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی" ہم نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ مرزا صاحب منحنی سے آدمی تھے اور وہ پہلوان مالشیہ ان پر سوار تھا۔ اس کے باوجود مرزا صاحب نہایت پرسکون نظر آرہے تھے۔

"بھئی یہ سوال تم ہزاروں مرتبہ کرچکے ہو، حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ میں ذرا جدت پسند ہوں۔ ہر میدان آزما چکا ہوں، اب سیاست ہی سہی۔"

"مگر مرزا صاحب آپ کو سیاست سے کب سے دلچسپی پیدا ہوئی۔" ہم نے پوچھا۔

"اخبارات پڑھ کر ——— یار ——— یہ سیاستدان پہلوانوں والے داؤں پیچ استعمال کررہے ہیں ——— لہٰذا میں نے سوچا کہ جب اکھاڑے میں اترنا ہی ٹھہرا، تو کیوں نہ اس کی بھی پوری تیاری کرلوں۔ یہ صاحب آدھ گھنٹہ مالش کرتے ہیں پھر کشتی کے داؤں پیچ سکھاتے ہیں۔ اس کے بعد ڈنڈے برسانے اور برستے ہوئے ڈنڈوں سے بچنے کا درس دیتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ تھوڑی ہی مدت میں مجھے عملی سیاست میں حصہ لینے کے قابل بنادیں گے۔"

"مگر مرزا صاحب، آپ کی شخصیت تو عوام کے لئے بالکل اجنبی ہوگی۔ آپ کس طرح ان کے سامنے آئیں گے۔" ہم نے سوال کیا۔

"سب کچھ سوچ سمجھ کر کر رہا ہوں۔ تھوڑی مدد تم سے بھی چاہتا ہوں۔ اخبارات میں تمہاری کافی جان پہچان ہے نا۔"

"جی ہاں، مگر....." ہم نے کچھ کہنا چاہا، لیکن انہوں نے بات کاٹ دی۔

"سیدھی پروگرام یہ ہے کہ ایک دن خبر آئے گی 'مشہور کل ہند مسلم لیگی اور عوامی نمائندے مرزا باقر علی خاں کے صاحبزادے مرزا واحد علی خاں عملی سیاست میں حصہ لیں گے۔"

"مرزا باقر علی خاں..... آپ کے والد صاحب۔"

"ہاں، ہاں۔ وہ غیر منقسم ہندوستان والی مسلم لیگ کے خاصے سرگرم کارکنوں میں سے تھے۔ اگرچہ کسی اونچے عہدے پر نہیں تھے اور نہ ہی نام و نمود کے خواہش مند تھے، مگر اب بھی ایک حلقہ انہیں بخوبی جانتا ہے..... بہر حال..... خبر یہی ہوگی..... اور اس کے ساتھ کچھ اس قسم کی تفصیل ہوگی کہ مرزا صاحب نے نہایت خاموشی سے تمام سیاسی پارٹیوں کے منشور کا جائزہ لیا، ان کے لائحہ عمل کو سمجھا، عزائم کو جانچا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر اس موقع پر وہ سیاست سے الگ رہے تو آنے والی نسلیں شاید انہیں کبھی معاف نہ کریں۔ وہ عوام کے سامنے وہی نظریہ اور آئین رکھنا چاہتے ہیں جس پر چل کر پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔"

"اف خدایا۔" ہم نے آنکھیں پھاڑیں۔ "تو آپ بھی دوسرے سیاستدانوں کی طرح بھولے بھالے عوام سے مذاق کرنا چاہتے ہیں۔"

"سنو تو سہی، اس خبر کے بعد کچھ اس قسم کی تصویریں دی جائیں گی۔ آج مرزا صاحب نے فلاں دکان کا افتتاح کیا۔ فلاں کمپنی کی عمارت کا سنگِ بنیاد نصب کیا۔ فلاں ہوٹل میں دانشوروں سے خطاب کیا۔ مشہور دکلار کے وفد سے ملاقات کی۔ طلبہ کے وفود سے ملے۔ ان کے مسائل میں دلچسپی ظاہر کی اور اپنی مکمل حمایت کا یقین دلایا۔ کسانوں کے نمائندوں سے ملاقات کی وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلے میں میرے مختلف دوست تمام انتظامات مکمل کر چکے ہیں۔ ایک دکان والا دو سو روپے پر اپنی دکان کا افتتاح کرانے پر راضی ہو گیا ہے۔ اپنے دوست نصرت کی کمپنی کا سنگِ بنیاد میں رکھوں گا۔ میرا ایک وکیل دوست وحید، چند وکیلوں کے ساتھ ملاقات کرنے آ رہا ہے۔ طلبہ کے وفود کے سلسلہ میں میرے دونوں بڑے لڑکے اپنے کالجوں کے لیڈر قسم کے طلبہ سے رابطہ قائم کر چکے ہیں۔ اب رہا ان تمام موقعوں پر اخباری نمائندوں اور فوٹوگرافروں کی موجودگی کا مسئلہ، تو وہ تمہیں حل کرنا ہوگا۔ اس سلسلہ میں اگر کچھ خرچ ہو تو وہ بھی مل جائے گا۔"

"مگر مرزا صاحب...."

"آں.... ہاں.... گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اس خیال کو دل سے نکال دو کہ میں عوام کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری افتادِ طبع ہی کچھ ایسی ہے۔ بس یوں سمجھ لو۔ ایک ناٹک کھیل رہا ہوں، یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ پبلسٹی مجھے کیا مقام بخشتی ہے۔"

"اوہ، تو یہ قصہ ہے"۔ ہم نے مسکرا کر ایک طویل سانس لی۔

"ہاں بھئی ـــ اور کیا۔"

"بس تو پھر ہم اپنے مکمل تعاون کا یقین دلاتے ہیں"۔ ہم نے ہنس کر کہا۔

"شکریہ، تم نے ایک بڑی الجھن رفع کر دی۔ بس اسی بات پر جاؤ اور اپنے تمام اخباری دوستوں کو تگڑا سا ڈنر دے ڈالو، اور بل میرے پاس بھیج دینا، کیا سمجھے۔"

اگلے دن ہم مرزا صاحب کے یہاں پہنچے، تو دیکھا برآمدے میں بیٹھے حجامت بنوا رہے ہیں، ہم نے سوچا خدا کا شکر ہے آج ان کے کٹے ہوئے بال نظر آئیں گے اس سے پہلے یا تو وہ سرے سے حجامت ہی نہیں بنواتے تھے یا اگر بنواتے تھے تو نہ بنوانے کے برابر۔

"آؤ بھئی نجمی، بڑے اچھے وقت پر آئے ہو، ہاں یار، ذرا دیکھنا، یہ حضرت جو بالوں کا انداز بنانے والے ہیں وہ کیسا ہے۔ میرا مطلب ہے، لیڈرانہ ہے یا نہیں۔"

"لیڈرانہ انداز ـــ" ہم ہنس پڑے۔ "مرزا صاحب، وہ کیسا ہوتا ہے، ہمارے خیال میں تو لیڈر عموماً فارغ البال ہوتے ہیں۔"

"بھئی میں چاہتا ہوں کہ میرے بالوں کا انداز بیک وقت فلسفیانہ اور شاعرانہ ہو، الجھے ہوئے بڑے بڑے مگر بے ترتیب نہیں، مطلب یہ کہ آدمی دیکھے تو سمجھے، کہ

ضرور کوئی بڑا مفکر اور عالم ہے، دیکھو میں نے انہیں سمجھایا تو ہے؟

کچھ دیر بعد بال بن گئے اور مرزا صاحب کی عین خواہش کے مطابق بنے۔ کافی دیر تک آئینہ میں بالوں کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیتے رہے، مطمئن ہو گئے تو حجام کو رخصت کر دیا۔

اندر آ کر انہوں نے میز پر رکھا ہوا ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا اور کمرے میں ایک آواز گونجنے لگی۔ آواز مرزا صاحب کی نہیں تھی اور بولنے والا فلمی انداز میں مکالمے ادا کر رہا تھا، ہم ذہن پہ زور دیتے رہے۔ آواز جانی پہچانی معلوم ہو رہی تھی۔ پھر ہمیں یاد آیا کہ وہ ایک مشہور فلمی اداکار کی آواز تھی جو تھیٹریکل انداز میں مکالمے بولنے میں خاصا مشہور تھا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے سوئچ آف کر دیا۔

"آج کل اس انداز میں بولنے کی مشق کر رہا ہوں" مرزا صاحب نے مسکرا کر کہا۔

وہ کیوں۔ ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بھئی بولنے کا بھی ایک خاص ڈھنگ ہونا چاہیئے۔ مجھے اس اداکار کا انداز بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اس کی آواز ایک فلم کے ساؤنڈ ٹریک سے حاصل کی ہے۔ اب دیکھو، میں کچھ اس انداز میں تقریر کروں گا۔" اتنا کہہ کر انہوں نے ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔ یہ مرزا صاحب کی آواز تھی۔ وہ اس اداکار کی نقل اتار رہے تھے، آواز تو پہلے ہی کراری پائی تھی، سونے پر سہاگہ اداکار کا انداز ہو گیا۔

"بھئی خوب، مرزا صاحب یہ انداز نہایت پُراثر اور دلکش رہے گا، تقریر اور

انٹرویو دونوں میں چلے گا۔"

" اسی لئے یہ انداز منتخب کیا ہے تاکہ عام لوگوں سے جدا لگا نہ معلوم ہو۔ آواز اور شخصیت دو ایسی چیزیں ہیں جس کے نقوش انسانی ذہنوں پر ہمیشہ قائم رہتے ہیں اسی لئے اس جانب زیادہ توجہ دے رہا ہوں۔"

" بہت خوب" ہم نے مسکرا کر کہا" مگر یہ تو معلوم ہی نہیں ہوا، آپ سیاسی جماعت بنائیں گے یا نہیں۔ اور یہ کہ آپ کس خیال کے لیڈر ہوں گے۔ سوشلزم کے حامی یا اسلام لسپند"

" اس مسئلے کو چھیڑوں گا ہی نہیں، اگر کسی نے پوچھا بھی تو یہ کہہ کر ٹال دوں گا کہ میرا مقصد صرف پاکستان کے بقا اور اس کے عوام کی بھلائی ہے اس کے علاوہ کوئی تیسری چیز میرے ذہن میں نہیں ہے"۔ انہوں نے اداکارانہ لہجہ میں کہا، اور ہم ہنس پڑے۔"

غرض کہ چند دنوں بعد مرزا صاحب نے اپنے پروگرام پر عمل شروع کر دیا، اخبارات میں یہ خبریں کچھ اس انداز میں آئیں کہ مرزا صاحب کی شخصیت جلد ہی عوام میں موضوع گفتگو بن گئی۔ ایک تو ان کا طے شدہ پروگرام ہی اتنا بھرپور تھا اوپر سے ان کے لیڈرانہ میک اپ نے کمال کر دیا، ہر زاویہ سے ایک منفکر نما لیڈر نظر آتے تھے، پھر اوپر نیچے ان کی طے شدہ مصروفیات کے سلسلے کی تصویروں اور خبروں نے مرزا صاحب کو بہت اونچا پہنچا دیا۔ اسی دوران میں ایک اخبار نے اپنے اداریہ میں بھی ان کا ذکر خیر،

شائع کر دیا جس میں ان کے خیالات اور عزائم کے علاوہ ان کے جداگانہ انداز تقریر کو بھی سراہا، اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر مرزا صاحب الیکشن لڑنے پر رضامند ہو گئے تو یہ ایک خوش آئند امر ہوگا۔ ہم یہ دیکھتے رہے اور دل ہی دل میں ہنستے رہے۔

اسی دوران میں ان سے ملاقات ہوئی، تو مسکراتے ہوئے بولے، کہو بھئی کیسا رہا ناٹک:

ہم نے کہا بہت کامیاب۔

"مانتے ہو نا، اب دیکھو ہر سیاسی جماعت مجھے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ روز سینکڑوں تار، ٹیلی فون اور خطوط آ رہے ہیں۔ پھر چونکہ کسی کو میرا نظریہ معلوم نہیں لہٰذا ہر جماعت اس کوشش میں ہے کہ میں اس میں شامل ہو جاؤں۔ خوب رسہ کشی ہو رہی ہے۔"

"واقعی،" ہم نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

"اور نہیں تو کیا جھوٹ، اور بھئی میں بھی انہیں خوب چکر دے رہا ہوں۔ یہی کہتا ہوں کہ فی الحال میں کسی جماعت میں شامل نہیں ہو سکتا۔ مجھے پہلے عوام سے پوچھنا ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ ہر شخص میرے خیالات جاننا چاہتا ہے۔ اسلام پسند ہو یا سوشلسٹ مگر میرا وہی ایک جواب ہے میں صرف قوم کا خادم ہوں۔ ملک کی بھلائی اور عوام کی خدمت میرا ایمان ہے۔"

"اس ناٹک کا انجام؟" میں نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

کچھ نہیں، خیال ہے جب طبیعت سنبھل جائے گی تو ایک بیان جاری کر دوں گا، کہ عوام مجھ جیسے لیڈروں کو سمجھنے کی کوشش کریں، ان کی باتوں اور شخصیت سے متاثر ہونے کی بجائے ان کے ماضی کو دیکھیں، صلاحیتوں کو پرکھیں، ان پر اعتماد کا اظہار کریں، نام نہاد لیڈروں کی بہتات ہے، جن کا نہ صرف ماضی داغدار ہے، بلکہ صلاحیتیں بھی زنگ آلود ہو گئی ہیں، یہ لیڈر قوم کے بدترین دشمن ہیں۔

مرزا صاحب ابھی تک میدان سیاست میں برسرِ پیکار ہیں اور بڑی بڑی آن بان والی سیاسی جماعتیں اس "بیباک" اور "نڈر" لیڈر کو اپنی صف میں شامل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں، اور سنا ہے کہ اب وہ بیان دیبان جاری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔

(۱۹۷۰ء)

مرزا صاحب اور الکشن

مرزا صاحب ایک بہت ہی دلچسپ پروگرام کے تحت سیاسی اُفق پر نمودار ہوتے تھے، پہلے تو ہم نے ان کے اس طریقۂ کار کو محض بچکانہ قرار دیا تھا مگر جب یکے بعد دیگرے وہ اپنے تیار کردہ پروگرام کے ہر ہر مرحلہ پہ کامیابی کے جھنڈے گاڑتے، عوام کے محبوب نظر بنتے چلے گئے تو ہم واقعی حیران رہ گئے تھے، ــ ایک ایسے شخص کا عوامی بن جانا جس کا کوئی سیاسی بیک گراؤنڈ نہ ہو، ــ یقیناً حیرت کی بات ہے۔

سیاسی میدان میں خم ٹھونکنے کے بعد مرزا صاحب نے آئندہ مرحلے یعنی الکشن کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ الکشن میں ان کی سنجیدگی دیکھ کر ہم بوکھلا گئے، کیونکہ مرزا صاحب نے ہمیں پہلے ہی یقین دلا دیا تھا کہ وہ سیاست کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ بلکہ محض تفنّنِ طبع کے لئے اس طرف متوجہ ہوئے ہیں۔

ان کا خیال تھا کہ جب وہ اپنے پروگرام ذ لوگوں پر اپنا سیاسی امیج (Image) قائم کرنا، میں کامیاب ہو جائیں گے تو خاموش ہو رہیں گے، کیونکہ بہر حال وہ سیاستداں نہیں تھے، بلکہ محض ایک ڈرامہ کر رہے تھے۔ جس میں ان کی حیثیت ایک اداکار سے زیادہ نہیں تھی ۔ مگر جب ہم نے سُنا کہ موصوف الکشن میں حصہ لینے کے لئے پَر تول رہے ہیں تو ہم فوراً ان کے پاس دوڑ گئے۔

ہمارے چہرے سے عیاں پریشانی کو تاڑتے ہوئے بولے "یہی کہنے آئے ہونا ۔ کہ ہم یکایک سیاست میں سیریس (Serious) کیسے ہو گئے"۔

"جی ہاں ۔ بالکل"۔

"تو سنو، ۔ برخوردار ۔ اتنے دنوں سیاست میں عمل دخل نے مجھے سنجیدہ ہونے پر مجبور کر دیا ہے ۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت جو لوگ بڑھ چڑھ کر بول رہے ہیں ان میں سے اکثر مجھ سے بھی گئے گذرے ہیں۔ جنہیں ملک و قوم سے کوئی ہمدردی نہیں ۔ بلکہ اقتدار کی بھوک انہیں اس طرف کھینچ لائی ہے میں جب خود کو ٹٹولتا ہوں تو اپنے آپ کو ان سے کہیں بہتر پاتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ الکشن میں کھڑا ہونگا۔"

"مگر... مگر... مرزا صاحب، آپ محض ایک ناٹک کھیل کر سیاسی میدان میں اُبھرے ہیں، نہ آپ کا کوئی سیاسی بیک گراؤنڈ ہے نہ آپ کو اس سے کبھی کوئی دلچسپی تھی..." ہم نے زور دے کر کہا۔

"بھئی۔ . . . اب تو دلچسپی لینا ہی پڑے گی۔ . . . جب میں غلط قسم کے لوگوں کو سرگرم عمل دیکھتا ہوں تو مجھے اس قوم کا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگتا ہے۔ میرا خیال ہے اس موقع پر خاموشی سے بیٹھے رہنا قطعی غلط ہوگا۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ یہ ملک و قوم سے غداری ہوگی۔"

الغرض کافی دیر تک سمجھاتے رہے لیکن ان کے دلائل ہمیں مطمئن نہ کر سکے، ہم نے اب تک ان کا محض اس لیے ساتھ دیا تھا کہ وہ اس ڈرامے کے پیچھے ایک تعمیری مقصد رکھتے تھے۔ وہ عوام کو ان نام نہاد سیاست دانوں سے خبردار کرانا چاہتے تھے، جو محض بلند بانگ دعوے کر کے عوام میں مقبولیت حاصل کر رہے تھے ـــــ ان کا خیال تھا کہ جب وہ خاصے مقبول ہو جائیں گے تو ایک بیان ان نام نہاد سیاست دانوں کے خلاف دے کر اپنے ڈرامے کا راز افشا کر دیں گے۔ . . . . . مگر اب . . . . . اب، وہ اپنے قول سے پھر چکے تھے۔ . . . یعنی اب ان میں اور نام نہاد سیاست دانوں میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔

حسب سابق الکشن کے سلسلہ میں بھی مرزا صاحب نے ایک باقاعدہ پروگرام بنایا تھا ـــ البتہ ان کا یہ پروگرام ہمیں نہیں معلوم ہو سکا کیونکہ ہم ان سے قطع تعلق کر چکے تھے۔ . . اب ہمیں مرزا صاحب یا ان کے پروگرام سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی ـــــ پہلے والے مرزا صاحب، اور ان میں زمین آسمان کا فرق تھا ـــــ کہاں وہ خلوص و محبت کا پیکر ـــــ کہاں یہ اقتدار کی ہوس کا مجسمہ۔ ـــــــ

خبر ملی ـــــ کہ محلہ میں ایک ویلفیر کمیٹی تشکیل دی گئی ہے، جو محلہ کے بھلائی کے کاموں میں لوگوں کو حصہ لینے پر آمادہ کرے گی ـــــ اور شہر کے اس حصہ کو ایک مثالی نمونہ بنا کر دکھائے گی ـــــ کمیٹی کا چیرمین محلہ کے ایک بزرگ کو چنا گیا ہے ـــــ مرزا صاحب بھی اس کمیٹی کے ایک ادنٰے کارکن کی حیثیت سے منسلک تھے ـــــ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ کمیٹی دراصل مرزا صاحب کے ذہن کی اختراع ہے۔ الکشن کے لئے راہ ہموار کرنے کے لئے شاید یہ ان کے پروگرام کا پہلا مرحلہ تھا۔ ہم ان کی ذہانت کے قائل ہو گئے۔ چیرمین ایک بزرگ کو مقرر کیا گیا تھا تاکہ لوگ ان کی نیت پر شبہ نہ کر سکیں۔ ظاہر ہے۔ ہماری طرح ہر ایک کو تو ان کے ارادے کا علم نہیں تھا۔

پھر خبر ملی کہ محلہ میں صفائی کی مہم کا آغاز ہوا ہے ـــــ خود ہم نے مرزا صاحب کو پاجامے کے پائنچے چڑھائے ہاتھ میں بالس والی جھاڑو لئے گلیوں میں گھومتے دیکھا ـــــ ایک جگہ ہمیں دیکھ کر چیکے ـــــ "آؤ میاں نجمی ـــــ بھئی معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اپنے محلہ کا کوئی خیال نہیں ہے، جبھی اس طرح کٹے کٹے پھر رہے ہو"

"اور مرزا صاحب ـــــ آپ کو کب سے خیال ہو گیا ہے محلہ کا ـــــ اس سے پہلے تو آپ بقول شخصے کالے آدمی سے بات تک کرنے کے روادار نہیں تھے" ہم نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"بھئی صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہ سمجھنا چاہیئے ـــــ تم کہو گے
میں یہ کہہ کر پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں، مگر حقیقت یہی ہے ـــــ آؤ میاں ـــــ
غصہ تھوک دو ـــــ اور ذرا میرا ساتھ دو ـــــ وہ دیکھو گلی کے نکڑ پر پتھروں
کا ایک ڈھیر سا لگ گیا ہے، اس سے اہل محلہ کو بڑی زحمت اٹھانی پڑتی ہے ـــــ
ذرا آؤ تو اس کو ٹھکانے لگا دیں ـــــ" وہ سہارا بازو تھامتے ہوئے بولے،
ہم سے نہ جانے کیوں انکار نہ ہو سکا۔ مجبوراً ہمیں بھی ان کا ساتھ دینا پڑا۔

ایک دن ہم اپنے پڑوسی حامد صاحب سے باتیں کر رہے تھے ـــــ دوران
گفتگو مرزا صاحب کا تذکرہ نکل آیا ـــــ حامد صاحب بولے۔ بھئی کمال ہو گیا ـــــ
مرزا کتنا بدل گیا ہے . . . . اماں کل تو حد ہو گئی . . . . سڑک پر بوڑھا شخص
کمر پر آٹے کا بڑا سا گٹھر اٹھائے چلا جا رہا تھا، مرزا صاحب نے کہیں دیکھ لیا، فوراً
دوڑ پڑے اور جلدی سے گٹھر اٹھا کر اپنے اوپر لاد لیا ـــــ پھر کہنے لگے۔ قبلہ، یہ
آپ کا کام نہیں ہے۔ لائیے یہ آٹا میں آپ کے گھر پہنچا آؤں ـــــ قریب ہی
ایک جگہ شادی کی تقریب تھی، سب کے سب لوگ شامیانے سے باہر نکل آئے۔
تعجب کی بات ہی تھی ـــــ مرزا خود اپنی پیٹھ پر وہ گٹھر لادے بوڑھے کے
ساتھ جا رہا تھا ـــــ "بھئی کمال ہو گیا ـــــ آدمی اتنا بھی بدل سکتا ہے
میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

یہ سن کر تو ہم بھی حیران ہوئے، مگر شادی کے شامیانے کے قریب ان کا یہ

خدمتِ خلق کا جذبہ بیدار ہونا کچھ کھٹک رہا تھا۔ ـــــ ہم نے حامد صاحب سے پوچھا، مگر آپ نے بوڑھے اور مرزا صاحب کے درمیان گفتگو کیسے سُنی؟"

"بھئی میں بھی نکاح میں مدعو تھا اور شامیانے کے باہر کھڑا ایک صاحب سے باتیں کر رہا تھا اور پھر مرزا اتنی اونچی آواز میں بول رہا تھا کہ تمام لوگوں نے اس کی باتیں صاف سنیں۔"

"اونچی آواز میں ـــــ" ہم کچھ سوچتے ہوئے زیرِ لب بڑبڑائے، ان کا اس موقع پر اونچی آواز سے بولنا بھی آدمی کو کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا ـــــ کیونکہ مرزا صاحب بہت دھیمی آواز میں گفتگو کرنے کے عادی تھے۔

پھر اطلاع آئی ـــــ کہ اب مرزا صاحب محلہ بھر کے بیمار لوگوں کی نہایت باقاعدگی سے عیادت کرتے ہیں۔ ـــــ نہ صرف گھریلو مجرب نسخوں سے انہیں آگاہ کرتے ہیں، بلکہ علاج کے سلسلہ میں ڈاکٹروں اور حکیموں کے نام بھی گوش گذار کرانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی مریض کے لئے خود اپنی جیبِ خاص سے ادویات فراہم کرتے ہیں مگر اس قسم کی ہمدردی محض ان مریضوں کے لئے مخصوص تھی جن کا خاندان لمبا چوڑا ہوتا تھا اور کفیل خود مریض ہوتا۔

اسی دوران جو فلو (صاحب) کی وبا پھوٹی تو مرزا صاحب بے چارے چکرا گئے ـــــ اب ہر گھر سے ایک آدھ شخص کے صاحبِ فراش ہونے کی اطلاع ملتی تھی۔ آج فلاں لیٹ گیا، تو کل فلاں بخار میں پھنکتا ہوا دفتر سے لوٹا ـــــ

مگر واہ رے مرزا صاحب ـــــ انہوں نے بھی اپنا معمول نہیں بدلا۔ ـــــ لیکن اب وہ صرف ان لوگوں کے گھروں پر حاضری دیتے جن کے خاندان میں بالغان کی فہرست طویل ترین ہوتی تھی۔ ـــــ اس کی وجہ عام لوگ شاید نہ سمجھ سکے ہوں مگر ہم .... فوراً سمجھ گئے کہ اس وقت مرزا صاحب اپنی اسکیم کے کونسے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں۔

الکشن جس تیزی سے نزدیک آرہے تھے مرزا صاحب اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے اپنے حلقہ میں شہرت و مقبولیت حاصل کرتے جا رہے تھے، اب تک انہوں نے الکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔

ان کی دیکھا دیکھی، حلقہ کے کئی صاحب حیثیت اور با اثر لوگوں نے مرزا صاحب کی نقل شروع کردی ـــــ کیونکہ بہرحال انہیں بھی الکشن لڑنا تھا ـــــ مگر بھلا وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی ـــــ خوب جانے پہچانے چہرے تھے، مطلب یہ کہ اس سے پہلے بھی ایسے موقعوں پر ان میں خدمت خلق کا جذبہ بیدار ہو جایا کرتا تھا مگر الکشن کے بعد پھر اپنی جگہ جا کر لمبی تان لیتا ـــــ اس کے برعکس مرزا صاحب سیاست میں نووارد تھے اور ان کی خدمت خلق کا سلسلہ کافی پہلے سے جاری تھا۔

آخر خود حلقہ کے لوگوں نے کہہ سن کر مرزا صاحب کو الکشن کے لئے کھڑا کر دیا۔ ظاہر ہے انہوں نے کافی پس و پیش کی ہوگی اور خود کو نااہل ظاہر کیا ہوگا ـــــ آزمائش میں نہ ڈالنے کی درخواست کی ہوگی ـــــ مگر لوگ ان کو اپنا نمائندہ چننے

پر مُنحصر ہوں گے۔

کئی پارٹیوں نے ٹکٹ پیش کئے ـــــ مگر انہوں نے نہایت خشک انداز میں سب کی پیشکش مسترد کردی ـــــ اور آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہونے کا اعلان کیا، لوگوں نے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا ـــــ بقول مرزا صاحب کہ میں تو بڑی شش و پنج میں تھا ـــــ کیونکہ میں کسی پارٹی سے متفق نہیں ہوں ـــــ آخر کار محلہ کی بزرگ ترین شخصیت کے حکم کے آگے سر جھکانا پڑا ـــــ یہ انہیں کا حکم ہے کہ مجھے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونا ہے۔ ـــــ

یہ بزرگ ہستی وہی ویلفیئر کمیٹی کے چیرمین صاحب تھے ـــــ جو ظاہر ہے مرزا صاحب کے آدمی تھے۔

الکشن ہوا ـــــ ظاہر ہے مرزا صاحب کو کامیاب ہونے سے کون روک سکتا تھا ـــــ بھلا ان کی اسکیم اور ناکام ہو جائے۔ ـــــ پھولوں کے ہاروں اور گلدستوں سے لدے ہوئے سارے محلہ کا شکریہ ادا کرتے پھرے۔

آج کل ـــــ یہ غور فرما رہے ہیں کہ کس پارٹی کی حمایت کا اعلان کر کے اپنے حلقہ کے "لوگوں کی آواز" کو اسمبلی میں موثر بنائیں۔

(سنہ ۱۹۷۰ء)

ادب کے ٹھیکے داروں سے معذرت کے ساتھ

- ادبی انعام
- ادبی کتب خانہ

ادبی انعام

اتوار کے دن ہم مرزا صاحب کے گھر پر اسی پابندی سے حاضری دیا کرتے تھے جس پابندی سے دفتر جاتے. جب تک مرزا صاحب سے گپ شپ نہ اُڑتی، اتوار، اتوار ہی نہ لگتا تھا۔

ایسے ہی ایک اتوار کو ہم ان کے یہاں موجود تھے۔ موضوع زیرِ بحث ایک نووارد ادیب تھا، جس نے حال ہی میں اپنے ایک ناول پر ادبی انعام حاصل کر کے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ حیرت کی بات ہی تھی۔ ادب کی دنیا میں حضرت کو جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہ ہوتے تھے کہ پہلے ہی ناول پر ایک تجارتی ادارے کا انعام لے بھاگے۔

ہم اس کے اس کارنامے پر تو خیر حیران تھے ہی، مگر اس سے کہیں زیادہ حیرانی

کی بات یہ تھی کہ اس واقعہ پر مرزا صاحب کو قطعی حیرت نہ تھی۔

جب ہم نے وجہ دریافت کی، تو کہنے لگے" ہوتا ہے۔ سب کچھ ہوتا ہے آج کل اثر و رسوخ اور تعلقات سے کیا نہیں ہوتا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ جب لوگ دوسرے کی حق تلفی گوارا نہیں کرتے تھے۔ بے چارہ ضرورت مند ہوگا لہٰذا انعام کا مستحق قرار دیا گیا یا پھر شہرت کا بھوکا رہا ہوگا۔"

" نہیں مرزا صاحب، ہم نہیں مان سکتے۔ بھلا اس طرح انعام کیونکر مل سکتا ہے، انعام کے اعلان کے لئے ایک کمیٹی بیٹھتی ہے، اخبارات و رسائل کی آرا کو سامنے رکھا جاتا ہے، باقاعدہ تنقید ہوتی ہے۔ بحثیں کی جاتی ہیں، تب جا کر جج صاحبان فیصلہ صادر فرماتے ہیں۔"

" ہاں ہاں، اس سے کس کافر کو انکار ہے، یہ سب ہوتا ہے مگر انعام اسی کتاب کو ملتا ہے جس کو " چند" لوگ چاہتے ہیں۔ یہ چند لوگ وہ خجادری ادبی ہستیاں ہیں جو بقول شخصے اپنے اوپر ادب کا اوور کوٹ لادے رہتی ہیں۔" مرزا صاحب نے مسکرا کر کہا۔

" لیکن مرزا صاحب، بھلا ان چند ہستیوں کی بات پوری کمیٹی کیسے تسلیم کر لیتی ہے۔ بھئی بات کچھ حلق سے نیچے نہیں اترتی۔"

میں نے کہا، " ان کے اوور کوٹ اس قدر دبیز نظر آتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کی، جو صلاحیتوں میں یقیناً ان سے بہتر ہوتے ہیں، ایک نہیں چلتی۔ وہ بے چارے خود بھی

ان کے آگے کچھ بھی نہیں بولتے کہ کہیں 'بے ادب' کی چھاپ لگا کر نکال باہر نہ کئے جائیں۔ میاں یہ تو وہ دور ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔" مرزا صاحب نے جواب دیا۔

ہم خاموش ہو گئے، مگر انہوں نے آنکھوں سے ہماری بے یقینی تاڑ لی۔

ہوں، معلوم ہوتا ہے کہ تم ابھی تک مجھ سے متفق نہیں ہو، خیر اب مجھے اپنی بات منوانے کے لئے عملی مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ تم جانتے ہو میری عادت، جب تک اپنی بات تسلیم نہ کرالوں مجھے چین نہیں آتا۔

"کیا مطلب؟" ہم چونک پڑے۔

"مطلب" وہ مسکرا کر بولے، "مطلب تم اچھی طرح سمجھتے ہو"

"بخدا مرزا صاحب، ہم کچھ بھی نہیں سمجھے"، ہم نے نا سمجھنے والے انداز میں گردن ہلائی۔

"میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب مجھے بھی ایک ادبی اعزاز حاصل کر کے اپنی بات درست ثابت کرنی پڑے گی۔"

"ادبی اعزاز اور آپ"، ہم ہنس پڑے اور وہ ہمیں گھورنے لگے، ہمارے لئے ان کی یہ بات دیوانے کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی، لہٰذا ہمارا ہنسنا بجا تھا۔

"اوہ، تو گویا آپ مذاق سمجھ رہے ہیں"۔ وہ سنجیدہ تھے "اس سے پہلے بھی کوئی موقع یاد ہے، جب میں اپنے کسی تجربے میں ناکام رہا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مرزا صاحب، مگر ادبی انعام ——— آپ کے

مضامین کبھی کبھار اخبارات میں ضرور دیکھے ہیں..... لیکن.....؛

" ہوں، تو آپ کے نزدیک میری تحریریں اس لائق نہیں ہوتیں جنہیں ادبی انعام سے نوازا جاسکے۔" وہ بُرا مان جانے والے انداز میں بولے۔

" جی.... جی.... وہ بات .....؛ ہم کچھ کہتے کہتے رک گئے، کہتے بھی کیا، ان سے اختلاف کی صورت میں ان کی دل شکنی ہوتی اور اتفاق کس طرح کر سکتے تھے جب کہ معلوم تھا کہ ان کا ادب میں مقام ہے ہی نہیں۔

" ٹھیک ہے۔" کچھ دیر بعد انہوں نے کہا۔ "میرا ادب میں کوئی مقام نہیں ہے، بات تو تبھی بنے گی نا۔ جب میں اس حالت میں بھی انعام کا مستحق قرار دیا جاؤں۔"

"ہماری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کی بات کا کیا جواب دیں۔" ہم بے چارگی سے بولے۔ ویسے مرزا صاحب کے عزائم بتارہے تھے کہ وہ کچھ نہ کچھ کر کے دکھائیں گے۔

" فی الحال صرف وقت کا انتظار کرو، ویسے تم نے اچھا مشغلہ سُجھا دیا، اتنے دنوں سے بیکار بیٹھے بیٹھے بور ہونے لگا تھا، اب کچھ دنوں تو ایکٹی وٹی رہے گی۔" وہ بائیں آنکھ دبا کر شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولے اور ہم سوچنے لگے۔

" خدا خیر کرے، دیکھیے، حضرت اس بار کیا شگوفہ چھوڑتے ہیں۔"

پھر معلوم ہوا کہ آج کل مرزا صاحب پر لکھنے کا بھوت سوار ہے۔ ہم نے جا کر دیکھا تو محض بنیان اور تہبند میں ملبوس رجسٹر پر جھکے ہوئے تھے، ہونٹوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔ اور آنکھیں اس انداز میں سکڑی ہوئی تھیں جیسے انہیں دھواں لگ

رہا ہو۔ بال بکھرے ہوئے تھے' ایش ٹرے راکھ اور سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھرا ہوا تھا قریب ہی پڑے کاغذات اور فائلوں کا ایک انبار لگا تھا۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔

"دیکھ لو برخوردار، تمہاری بے یقینی دور کرنے کے لئے کیا پاپڑ بیل رہا ہوں۔ سارا پرانا ریکارڈ چھاننا پڑ رہا ہے۔ کسی زمانے میں ناول نگاری کا خبط تھا مجھے، اس خبط کا نچوڑ ایک جگہ جمع کر رہا ہوں' تاکہ ایسی چیز تیار ہو سکے جو انعام کی مستحق قرار دی جا سکے۔"

"خدا آپ کو اپنے مشن میں کامیاب کرے، ہمیں تو اجازت دیجئے، ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔" ہم نے انہیں مصروف دیکھ کر بہانہ بنایا اور چلے آئے۔

پھر معلوم ہوا کہ ایک دوست کے توسط سے بہت بڑے پبلشر سے ناول کی اشاعت کے سلسلہ میں مذاکرات ہو رہے ہیں۔ خدا جانے کس طرح انہوں نے پبلشر کو ناول شائع کرنے پر راضی کیا۔ ویسے پتہ چلا تھا کہ پبلشر کی کوئی دُکھتی رگ' ان کے ہاتھ آگئی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ناول نہایت شان و شوکت سے چھپ رہا ہے۔ سرورق ملک کے مانے ہوئے مصوّر کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

ہم سوچنے لگے" اس دفعہ بھی مرزا صاحب کی ناکامی کے امکانات کم ہی نظر آتے ہیں۔ ہر بار میرا یار ایک عجیب ہی انداز میں اٹھتا ہے۔

پھر اخبارات میں ناول کے اشتہارات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان اشتہاروں کے ساتھ مرزا صاحب کی تصویر بھی شائع ہو رہی تھی اور انہیں ایک ایسا گمنام ادیب قرار

دیا جا رہا تھا جو قلم چھوڑ چکا تھا اور کئی چوٹی کی ادبی شخصیتوں کے پیہم اصرار پر دوبارہ لکھنے پر راضی ہوا تھا۔ یہ ایسا شوشہ چھوڑا گیا تھا جس نے لوگوں کو تجسس میں ڈال دیا تھا۔

پھر مرزا صاحب نے اپنے ایک اخباری دوست کو نامعلوم کیا پٹی پڑھائی کہ اس نے ان پر ایک عدد مضمون لکھ مارا اور تصویر بھی چھاپی اور تصویر بھی اس موقع کی جب وہ لکھنے میں مصروف تھے، یعنی بنیان اور تہہ بند والی۔ غرض کہ ناول کے مارکیٹ میں آنے سے پہلے وہ عوام میں خاصا متعارف ہو گئے تھے، ادبی حلقوں میں بھی ان کا ذکر ہونے لگا تھا۔ ادھر ہم سوچ رہے تھے، مار دیا ہاتھ، مگر ادبی انعام —— ؟ شاید وہاں تک پہنچ نہ ہو سکے۔

ادھر مرزا صاحب پوری جانفشانی سے اپنے مشن کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل تھے۔ پھر ہم نے ایک ایسا منظر دیکھا کہ آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ مرزا صاحب بقول ان کے ایک "جغادری ادیب" کے ساتھ گھومتے پائے گئے۔ یہ ادیب ادبی حلقوں کی جان سمجھے جاتے تھے اور ان کا کافی اثر تھا۔ مرزا صاحب کو ان تک پہنچنے کے لئے بڑی دور کی سوجھی تھی۔ انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ ادیب صاحب مکان بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سب کچھ تیار ہے مگر مکان کا نقشہ منظور نہیں ہو پا رہا۔ کچھ ایسی تکنیکی خامیاں تھیں جو آڑے آ رہی تھیں —— چنانچہ مرزا صاحب نے ایک ادبی محفل کے موقع پر ان سے دوستی گانٹھ لی اور جب مکان کے نقشے کا تذکرہ چھڑا، تو انہوں نے فوراً

اپنی خدمات پیش کردیں۔ اور کیوں نہ کرتے ـــــ ان کے ماموں اسی محکمہ میں کام کرتے تھے۔ پھر وہ ایسا سنہری موقع کیونکر گنوا دیتے، ادیب صاحب نے ان کا پیشگی شکریہ ادا کیا کیونکہ وہ تو ہمت ہار چکے تھے، پھر نقشہ پاس کرا دیا گیا اور یہ کام کچھ اس انداز میں انجام دیا جیسے انہیں اس کے لئے سخت تگ و دو کرنی پڑی ہو، ادھر وہ ادیب صاحب شکریہ ادا کرتے کرتے تھکے جاتے تھے۔ پھر مرزا صاحب نے ان پر اپنی گرفت مزید مضبوط کرنے کے لئے مکان کی تعمیر کی تمام ذمہ داری اپنی سر لے لی۔ ان کی ان بے لوث خدمات نے ادیب صاحب کو ان کا گرویدہ بنا دیا ـــــ اور ہم مرزا صاحب کی صلاحیتوں کے دل سے قائل ہو گئے۔

ان کا ناول نہایت شان و شوکت سے شائع ہوا ہم نے بھی دیکھا، بہترین کاغذ، اعلیٰ کتابت اور دیدہ زیب طباعت تھی۔ سرِ ورق بھی بے حد دلکش تھا۔ ہم نے تھوڑا بہت اِدھر اُدھر سے پڑھا، لیکن کوئی خاص بات معلوم نہ ہوئی۔ ویسے تحریر میں اس لحاظ سے نیا پن ضرور تھا کہ اس میں جگہ جگہ فارسی اور ہندی کے الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔

پھر ان کے ناول کی افتتاحی تقریب میں ہم بھی شریک ہوئے، جو آرٹ کونسل کے ہال میں اسی جغادری ادیب کے زیرِ صدارت منعقد ہوئی تھی۔ کئی بڑے بڑے دانشور اور نقاد بھی موجود تھے۔ صدر صاحب نے ناول کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیئے، اور آخر میں مرزا صاحب کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ غرض کہ

تقریب کامیاب رہی اور اخبارات میں کئی دن تک اس کے متعلق خبریں شائع ہوتی رہیں۔ ناول کی مارکیٹ رپورٹ بھی حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔ کچھ پبلسٹی ہی اس ڈھنگ سے ہوئی تھی جس نے مصنف کے بارے میں خاصا سسپنس پیدا کر دیا تھا۔

اس کے بعد انہیں ادیب صاحب کے ایما پر مصنفوں کی انجمن نے مرزا صاحب کے ساتھ ایک شام منائی جس میں ان کے "تازہ ناول کی کامیابی پر انہیں خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ چند حضرات نے ناول کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کئے۔ مرزا صاحب کے طرزِ تحریر اور اندازِ بیان پر مقالے پڑھے گئے: "ناول اپنی شگفتہ بیانی میں اپنی مثال آپ ہے"، "ہندی اور فارسی کے الفاظ جس خوبصورتی سے اُردو میں سموئے گئے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے"، "آج کل کے معاشرے کی خوب عکاسی کی گئی ہے"، وغیرہ وغیرہ۔

اور جب ہم مرزا صاحب سے ملے تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب کہو"

ہم جھینپتے جھینپتے سے بولے، "واقعی مان گئے آپ کو، آپ سے جیتنا مشکل ہے۔"

پھر رک کر بولے، "اب کیا پروگرام ہے۔۔؟"

"کچھ بھی نہیں، بس اب آخری مرحلہ رہ گیا ہے"۔ انہوں نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔ ہم نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا، اور پھر بند کر لیا۔ خاموش رہنا ہی بہتر تھا ان کی صلاحیتوں سے کچھ بعید بھی نہ تھا۔ لہٰذا ایسی صورت میں ان کے خلاف کچھ کہہ

کہ بعد میں ہمیں ہی شرمندگی اٹھانی پڑتی۔

پھر خبر ملی کہ کتابوں پر انعامات دینے کے لئے دانشوروں اور ادیبوں کی کمیٹی بنا دی گئی ہے۔ کمیٹی کے سربراہ وہی جغادری ادیب تھے —— ہم سوچنے لگے کہ مار دیا پالا۔ کیونکہ اب ان دونوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے بچپن کے لنگوٹیئے ہوں۔ اسی دوران میں مرزا صاحب نے مختلف بہانوں سے کئی عدد دعوتیں کر ڈالیں۔ کبھی دوبارہ ادبی دنیا میں قدم رکھنے کے جشن کے سلسلہ میں، تو کبھی کسی بچہ کی سالگرہ کے موقع پر۔ ان دعوتوں میں ادیب اور شاعر خصوصیت سے مدعو کئے جاتے، پھر بھلا اس انعامی کمیٹی کے ارکان ان میں شامل کیوں نہ ہوتے مرزا صاحب کو معلوم ہوا کہ ممبروں کی انعامی فہرست میں کئی نام ہیں۔ ان میں بعض اس سے قبل بھی انعامات حاصل کر چکے ہیں۔ کمیٹی کے سربراہ تو خیر اپنے ہی آدمی تھے مگر بقیہ ممبروں کے سروں پر بھی ہاتھ پھیرنا تھا، اس سے قبل کہ وہ کوئی پلان بناتے ان ادیب صاحب نے خود ہی یہ مشکل آسان کر دی۔ کہنے لگے!

"بھئی میں نے تمہاری کتاب بھی کمیٹی کے سامنے پیش کر دی ہے۔"

مرزا صاحب نے ایک شان بے نیازی کے ساتھ سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے جواب دیا۔ "جب آپ موجود ہیں، تو مجھے کوئی فکر نہیں ہے، مجھے معلوم ہے، کہ آپ کو خود خیال ہوگا۔"

یہ بات انہوں نے کچھ اس طرح کہی کہ وہ جغادری ادیب اس کا اصل مطلب

سمجھ گئے۔ کچھ سوچ کر گویا ہوئے۔" اگر تم تھوڑی سی مدد کا وعدہ کرو، تو مجھے مزید آسانی ہو سکتی ہے۔ تمہیں شاید علم ہو گا کہ حکومت کی جانب سے جرنلسٹ ہاؤسنگ سوسائٹی کی اسکیم ہے۔ کچھ اراضی اس کے لئے مخصوص کی جا چکی ہے جو رعایتی داموں پر مستحق ادیبوں اور اہل قلم حضرات کو فراہم کی جائے گی ـــ ہماری انجمن کے" قریباً تمام ارکان نے درخواستیں دی ہیں۔ کمیٹی کے ممبران بھی ان میں شامل ہیں، اب....

"میں سمجھ گیا..... "مرزا صاحب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔" اور یہ یقین دلاتا ہوں کہ اس سلسلہ میں حتی المقدور کوشش کروں گا۔ کمیٹی کے ممبران نامور ادبی شخصیتیں ہیں جن کی ادبی خدمات مسلّم ہیں۔ میرا خیال ہے انہیں دوسروں پر ترجیح دینی چاہیئے۔ یہی مطلب ہے نا اس کا۔"

"بس... بس... یہی میں چاہتا تھا۔ اگر وہ تم سے مدد کی درخواست کریں تو جواب یہی ہونا چاہیئے۔"

کچھ دنوں بعد انعام یافتہ ناول کا اعلان ہوا، تو ہم اُچھل پڑے۔ مرزا صاحب ہی کا ناول تھا۔ کافی دیر تک آنکھیں مَل مَل کر اخبار دیکھتے رہے، مگر نہیں صاحب .... نام انہیں کا تھا۔ ہماری نظروں کے سامنے مرزا صاحب کا مسکراتا ہوا چہرہ گھومنے لگا۔ فتح و کامرانی سے بھرپور مسکراہٹ رقصاں تھی۔ جب ہم ان سے ملے، تو وہ بے اختیار ہم سے لپٹ گئے۔" اب کہو، تمہاری بے یقینی دور ہوئی یا نہیں۔

"ہو گئی ـــــــــــ "ہم نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"اور آپ کان پکڑتے ہیں کہ آپ سے کسی بات میں اختلاف نہیں کریں گے۔ کیونکہ بعد میں ہمیں خود ہی شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔"

(سنہ ۱۹۷۱ء)

•

ادبی کتب خانہ

نہ جانے ان جغادری ادیبوں کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی کہ ایک عدد "ادبی کتب خانہ برائے بہبود ادبا و شعرا" کے قیام کا اعلان کر دیا۔ کتب خانہ کے قیام کا مقصد ایسے نادار، معذور اور عمر رسیدہ قلم کاروں کی امداد کرنا تھا جو بڑی کسمپرسی کی حالت میں زندگی گذار رہے تھے۔ تجویز یہ تھی کہ کتب خانہ کی آمدنی سے ان کی تخلیقات شائع کی جائیں گی اور معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ اس طرح دو مقصد حاصل ہوں گے۔ ایسے فنکاروں کے شاہکار جو صندوقوں میں بند پبلشروں کے وعدوں کے انتظار میں دیمک کی نذر ہو رہے ہیں منظر عام پر آسکیں گے اور فنکاروں کی مالی امداد بھی ہو جائے گی۔

ظاہر ہے اس فیصلہ کا ہر جگہ خیر مقدم ہوا، اور ہمیں تو اس اعلان پہ بے انتہا

خوشی ہوئی اور اس کا سبب تھے فکری صاحب۔

فکری صاحب ہمارے دوست تو تھے ہی، مگر ایک بہت بڑے افسانہ نگار بھی تھے۔ یہ بات اور ہے کہ بڑی بڑی ادبی محفلوں کے دھتکارے ہوئے تھے انہیں "دم ہلانے" کی عادت نہ تھی، نہایت صاف گو اور بے باک انسان تھے اور ان کی یہی خوبی ادبی محفلوں کے حکمراں "جغادری ادیبوں" کو نہیں سہاتی تھی لیکن فکری صاحب نے اس کی کبھی پرواہ نہ کی کہ "بڑے" ان سے خفا ہیں۔ وہ تو اپنی دھن میں مگن تھے اگر جسمانی لحاظ سے تندرست ہوتے، تو نہ جانے کیا کر گزرتے، بے چارے ایک ٹانگ سے معذور تھے اور لکڑی ٹیک ٹیک کر چلتے تھے۔ آمدنی کا باقاعدہ کوئی ذریعہ نہ تھا ایک اخبار میں کالم لکھنے کی آمدنی اتنی نہیں ہوتی کہ آدمی ٹیکسیوں میں سفر کر سکے، گزر اوقات ہی مشکل سے ہو پاتی تھی۔ ہم ان کے لیے مغموم رہتے تھے اور سوچتے کہ اس دور میں فنکار کی کوئی قدر نہیں ہے۔ باقاعدہ ملازمت کے لئے کافی بھاگ دوڑ کی، مگر سفارش نہ ہونے کے سبب ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ انہیں اپنے افسانوں کے مجموعے کی اشاعت کا بڑا ارمان تھا، کئی بار اس سلسلہ میں ناشروں سے گفت و شنید بھی ہوئی مگر ہر جگہ سے یہی جواب ملتا۔

"آج کل افسانوں کی مارکیٹ نہیں ہے اگر کوئی چیز چھپوانا ہی چاہتے ہو، تو ناول لکھ لاؤ، کسی زنانہ نام سے شائع کر دیں گے۔"

کتب خانہ کا اعلان سن کر ہم نے سوچا، اب فکری صاحب کے افسانوں

کا مجموعہ ضرور شائع ہو جائے گا ہم نے فکری صاحب کو خوش خبری سنائی تو ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

"مجھے امید نہیں، یہ وہی لوگ ہیں نا جو مجھے منہ پھٹ اور بے ادب کہہ چکے ہیں ان سے کوئی توقع رکھنا فضول ہے"

"نہیں فکری صاحب، ایسا بھی کیا، اس کتب خانے کا تو مقصد ہی آپ جیسے لوگوں کی مالی امداد کرنا ہے۔ آپ دل کھٹا نہ کریں۔ خدا کی ذات سے بہتر توقع رکھنا چاہیے" ہم نے تسلی دی، مگر ان کی آنکھوں سے بے یقینی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔

ایک ماہ کے اندر اندر کتب خانہ قائم ہو گیا۔ خوادری ادیبوں نے اس سلسلہ میں خاصی بھاگ دوڑ کی، مخیر حضرات سے عطیات جمع کئے، عوام سے چندہ اکٹھا کیا، اس کے علاوہ حکومت نے بھی امداد کا وعدہ کر لیا تھا۔

پہلی کتاب جو شائع ہوئی وہ ایک مشہور اور نامور ادیب کا ناول تھا۔ ہمیں بڑی حیرت ہوئی، کیونکہ یہ ادیب صاحب خاصے دولت مند تھے، اور ذاتی اخراجات سے بھی ناول شائع کرا سکتے تھے۔ چھان بین کرنے پر پتہ چلا کہ ادارے کی ساکھ قائم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ پہلے کسی نامور فنکار کی تخلیق پیش کی جاتی۔ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ لہٰذا ہم مطمئن ہو گئے۔

کتب خانہ کی ورکنگ کمیٹی تمام تر خوادری ادیبوں اور شاعروں پر مشتمل تھی بالفاظ دیگر یہی حضرات کتب خانے کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ پہلی کتاب

کی اشاعت کے بعد اوپر نیچے کئی کتابیں شائع ہوئیں جو سب کی سب ورکنگ کمیٹی کے ارکان کی لکھی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ ورکنگ کمیٹی کی قرارداد میں پہلے ہی یہ بات طے ہو گئی تھی کہ آغاز میں ادارے کی بہتری کی خاطر کمیٹی کے اراکین اپنی ایک ایک تخلیق کتب خانے کو پیش کریں گے۔

بہر حال، ایک دن ہم بھی فکری صاحب کے افسانوں کا مجموعہ لے کر پہنچ گئے۔ کتب خانے کے منیجر صاحب کی بارگاہ میں ہماری پیشی ہوئی۔ یہ منیجر صاحب ادارے کے ملازم تھے اور ایک بہت بڑی ادبی ہستی کے سالار جنگ ہوتے تھے۔ کمیٹی کے ایک رکن بھی تشریف فرما تھے۔

ہم نے آنے کا مقصد بیان کیا اور افسانوں کا مسودہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ منیجر صاحب نے بڑے انکسار کے ساتھ مسودہ ان جغادری ادیب کی طرف بڑھا دیا جو کسی خیال میں گم سگریٹ کے کش لے رہے تھے۔

"یہ ایک مسودہ آیا ہے" منیجر صاحب نے کہا۔ وہ چونکے اور ہمیں دیکھنے لگے۔ پھر مسودے کی طرف متوجہ ہوئے، پہلا صفحہ الٹا، فکری صاحب کا نام پڑھ کر ماتھے پر بل پڑ گئے۔ "آپ کے افسانے ہیں؟" انہوں نے پوچھا گویا فکری صاحب کوئی غیر معروف شخصیت ہوں۔

"جی نہیں" ہم نے مختصر سا جواب دیا۔

"پھر، وہ خود کیوں نہیں آئے" پوچھا گیا۔

ہم نے مجبوری نبائی۔ کچھ سوچتے رہے، پھر یونہی صفحات الٹنے لگے، مقصد پڑھنا نہیں تھا، غالباً یہ سوچنا تھا کیا جواب دیا جائے۔ آخر کہنے لگے۔

"افسانے نہیں، کوئی ناول لائیے۔"

ہم نے ایک طویل سانس لی۔ "یہی پبلشرز کہتے ہیں۔ لیکن اس ادارے کا مقصد تو شاید یہ نہیں ہے۔"

"اوہ، یہ مطلب نہیں، ہم افسانے بھی چھاپیں گے، مگر کچھ عرصہ بعد۔ فی الحال ناول پر زور دے رہے ہیں، محض ادارے کی بہتری کی خاطر۔ خود ورکنگ کمیٹی کے ایک صاحب کے افسانے شائع نہیں کئے گئے۔" ان کا جواب تھا۔

ہم ناکام واپس ہوئے، فکری صاحب کو بتایا، تو کہنے لگے "دیکھا تم نے، ٹال دیا نا۔"

"نہیں،" ہم نے پرعزم لہجہ میں کہا۔ "یہ مجموعہ ضرور چھپے گا۔ لیکن پہلے آپ ایک ناول لکھیے۔"

"ناول۔" وہ چونکے۔

"ہاں، ناول چھپ جائے تو پھر افسانے بھی شائع ہو جائیں گے۔"

"نہیں بھئی، چھوڑو بھی۔ وہ لوگ مخلص نہیں معلوم ہوتے۔" فکری صاحب نے لاپروائی سے کہا۔

"جی نہیں، ناول تو آپ کو لکھنا پڑے گا، ہم بھی تو دیکھنا چاہتے ہیں، یہ لوگ

کتنے مخلص ہیں۔ آپ ہمارے کہنے سے ایک ناول لکھئے، کسی بھی افسانے کے مرکزی خیال کو سامنے رکھ کر۔ اگر آپ کے بھی ٹال مٹول کی تو پھر دیکھئے۔ ہم ان کی کیسے خبر لیتے ہیں۔" ہم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا، وہ راضی ہو گئے۔

آخر ناول مکمل ہو گیا۔ بڑا ہی دلچسپ اور فکر انگیز ناول تھا۔ موضوع معاشرے کا اونچا طبقہ تھا، ہمیں یقین تھا عوام میں ضرور مقبول ہو گا۔

ہم مسوّدہ لے کر ایک بار پھر کتب خانے میں جا دھمکے، اتفاق سے وہی خجادری ادیب موجود تھے جنہوں نے ناول لانے کا مشورہ دیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔

"کیوں جناب، لکھوا لائے ناول"۔ انہوں نے کچھ ایسے انداز میں کہا جیسے مصنف سے ہمارا کمیشن طے ہوا اور ہم اسے جھپٹنے کی فکر میں ہوں۔ ہم نے ان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے مسوّدہ سامنے رکھ دیا۔ کچھ دیر الٹتے پلٹتے رہے پھر بولے، "ایک ہفتہ بعد تشریف لائیے۔ اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیں گے۔"

ہم "بہت مناسب" کہہ کر چلے آئے۔

چکر پر چکر لگائے، کبھی جواب ملا، ایک دو دن بعد آئیے گا، کبھی کہا گیا، خجادری ادیبوں کی ٹیم مسودوں کے سلسلہ میں مختلف شہروں کے دورے پر نکلی ہوئی ہے نکری صاحب تو مایوس تھے، مگر ہم نے ہمت نہ ہاری۔ آخر انیسویں چکر پر فیصلہ سنایا گیا، تو ہم دم بخود ہو کر رہ گئے۔ فیصلہ ایک لیٹر پیڈ پر لکھا ہوا تھا۔ کمیٹی کے سات

اراکین نے اپنے اپنے خیالات کچھ اس طرح درج کئے تھے۔

۱۔ ناول کی اٹھان اچھی ہے مگر مصنف موضوع نبھا نہ سکا۔

۲۔ ناول میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔

۳۔ موضوع اچھا ہے مگر تحریر جاندار نہیں۔

۴۔ اس ادارے کے تحت شائع ہونے کے لائق نہیں۔

ہم ناول کا یہ پروانۂ قسمت لے کر واپس ہوئے اور سوچنے لگے کس منہ سے فکری صاحب کے سامنے جائیں۔ اپنے ناول کے متعلق یہ ریمارکس پڑھ کر کس قدر دل آزاری ہوگی۔ کافی دیر تک الجھتے رہے۔ اچانک مرزا صاحب یاد آئے، دل میں امید کی ایک کرن روشن ہوئی۔

"کیوں نہ ان سے مدد حاصل کی جائے" اور ہمارے قدم بے اختیار مرزا صاحب کے مکان کی جانب اٹھنے لگے۔

تمام حالات انہیں سنائے اور مدد کی درخواست کی۔

کہنے لگے "بھئی، تم بھی بڑے بھولے ہو، بھلا اس جغادری جھتے کی موجودگی میں سیدھی انگلیوں سے بھی گھی نکل سکتا ہے"۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے پھر ابھر کر بولے۔

"اچھا، کچھ نہ کچھ تدبیر کروں گا"

ہم کسی حد تک مطمئن چلے آئے۔

"تیسرے دن مرزا صاحب صبح ہی صبح ہمارے یہاں آن دھمکے۔ ہاتھ میں ایک فائل تھی، کہنے لگے "چلو ذرا ادبی کتب خانہ تک ہو آئیں۔"

"کیا فکری صاحب کے سلسلہ میں" ہم نے پوچھا۔

"اماں تم آؤ تو۔ فی الحال اپنا ایک کام ہے" انہوں نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ہم ان کے عزائم سے قطعی ناواقف ان کے ساتھ ہو لیے۔

آج مینیجر صاحب کے دفتر میں ایک اور ادبی ہستی تنہا موجود تھی، یہ ہستی اپنی خرد ماغی اور بدکلامی کی وجہ سے کافی شہرت رکھتی تھی۔ ان کا تعلق بھی ورکنگ کمیٹی سے تھا۔ مرزا صاحب نہایت بے تکلفی سے ان کے سامنے جا کر بیٹھ گئے اور بولے۔

"جناب ایک ناول لکھا تھا، حالات ایسے نہیں تھے کہ شائع کر سکتا۔ اس کتب خانے کے قیام کا اعلان پڑھا، تو یقین مانیے دل باغ باغ ہو گیا، واقعی صاحب آپ لوگوں نے ہم ایسے قلاشوں پر بڑا کرم کیا ہے۔"

"شکریہ ۔ ۔ ۔ جناب کی تعریف؟" وہ صاحب بولے، اس پر مرزا صاحب نے اپنا نام بتایا، نام سن کر وہ صاحب چند لمحے سوچتے رہے، پھر بولے "میری بدقسمتی ہے، میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں پڑھا۔"

"جی ہاں ـــــ دراصل میں تقسیم سے قبل باقاعدہ لکھا کرتا تھا، پھر جی اچاٹ ہو گیا، اب اس کتب خانے کے قیام سے دوبارہ لکھنے کا حوصلہ پیدا ہوا ہے۔"

"ہوں ـــ لائیے ـــــ دیکھوں آپ نے کیا لکھا ہے۔" انہوں نے ہاتھ بڑھاتے

ہوئے کہا۔

"ناول ابھی نہیں لایا، ایک افسانہ ہے، میں چاہتا ہوں پہلے آپ میرا انداز تحریر دیکھ لیجئے"۔ مرزا صاحب نے ایک فائل کھول کر افسانے کا مسودہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ چند لمحے ادھر ادھر دیکھتے رہے، پھر بولے۔

"بہتر ہے، آپ دو دن بعد تشریف لائیں۔ آپ کے اس افسانے سے اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کی تخلیقات ہمارے ادارے کے کس حد تک کام آ سکتی ہیں"۔

مرزا صاحب نے سر ہلایا، اور اٹھ کھڑے ہوئے، ہم کچھ نہ سمجھ سکے کہ مرزا صاحب اپنا افسانہ پیش کر کے کون سی چال چل رہے ہیں۔ کافی ٹٹولا مگر کوئی واضح جواب نہ ملا۔

تیسرے دن وہ پھر دفتر میں موجود تھے، ادبی ہستی کسی کام میں مشغول تھی، کچھ دیر بعد انہوں نے قلم رکھا اور مرزا صاحب کی جانب متوجہ ہوئے، پھر کچھ بولے بغیر دراز ٹٹول کر مرزا صاحب کا افسانہ نکالا اور بولے،

"جناب مجھے افسوس ہے ہم آپ کی تخلیقات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے یہ افسانہ موضوع کے اعتبار سے گھسا پٹا ہے۔ تحریر میں کوئی خاص کشش نہیں ابھی آپ کو مشق کی ضرورت ہے۔"

"اوہ ــــــ مگر جناب، میں تو ایک عرصہ سے لکھ رہا ہوں، اور میرے افسانے اپنے وقت کے مشہور ترین اور معیاری رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو افسانے میں کیا خامی نظر آئی"۔

"مجھے ہی نہیں، کمیٹی کے کئی ارکان نے افسانہ پڑھا اور اسی نتیجہ پر پہنچے۔ یہ دیکھئے، افسانے کے ساتھ ان کے ریمارکس بھی تحریر ہیں"۔ انہوں نے افسانہ مرزا صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ مرزا صاحب نے افسانہ اٹھالیا، پھر کچھ دیر بعد طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

"خوب، مجھے معلوم نہ تھا کہ اس ادارے کا مقصد ہم مفلس اور نادار فنکاروں کی بے توقیری کرنا اور بے عزتی کرنا ہے، گویا اب وہ لوگ جن کا نام ادب میں ایک عرصہ سے سنا جا رہا ہے، غیر معیاری چیزیں لکھنے لگے ہیں، واہ رے زمانے"۔

"جناب آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ میرا ہی نہیں، ادب کی چوٹی کی ہستیوں کا متفقہ فیصلہ ہے"۔ انہیں بھی غصہ آگیا۔

"ان ادبی ہستیوں کو میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں، ویسے محترم، آپ کی اطلاع کے لئے عرض کردوں کہ یہ افسانہ میرا نہیں ہے بلکہ ملک کے ایک مشہور و معروف ادیب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے"۔ مرزا صاحب نے ان کی جانب جھک کر آہستہ سے کہا اور ہم چونک پڑے۔

"کیا کہا آپ نے، آپ مذاق کر رہے ہیں"۔ وہ غیر یقینی انداز میں مسکرائے۔

"اگر یقین نہ آئے تو ماہنامہ "ادبستان" کے دفتر ٹیلیفون کرکے پوچھ لیجئے، اگلے ماہ کی اشاعت میں یہ افسانہ شامل ہوگا"۔ مرزا صاحب مسکرائے۔

"کس کا افسانہ ہے"۔ وہ اچانک نرم پڑ گئے۔

پھر مرزا صاحب نے ایک مشہور ادیب کا نام لیا جو اعلیٰ عہدیدار تھے اور کتب خانہ کے قیام میں انہوں نے بھرپور تعاون کیا تھا۔ سرکاری گرانٹ حاصل کرنے میں ان کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ یہ نام سن کر نوان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ نروس سے ہو گئے۔ خود ہمارے اوپر حیرتوں کا گویا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ منہ کھولے مرزا صاحب کو دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے ٹیلیفون پر رسالے کے دفتر سے رابطہ قائم کیا، معلوم ہوا افسانہ آئندہ شمارے میں موجود ہے ــــ بے چارے بری طرح سٹپٹا گئے۔

ہم سوچنے لگے، کیا داؤ مارا ہے پٹھے نے، ــــ وہ ادیب صاحب بت بنے بیٹھے تھے، انہیں کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا جواب دیں۔

"بیٹھئے جناب،" انہوں نے مریل سی آواز میں کہا، "دراصل یہ افسانہ ہمارے ادارے کے ایک معمولی اسٹاف ممبر نے پڑھا تھا، پھر اس نے جو رائے قائم کی، اسی بنا پر دو کر ارکان نے بھی رائے کا اظہار کر دیا۔ ہم اس کا دوبارہ مطالعہ کریں گے۔"

"جی شکریہ، اب تو ان قیمتی آرا سے صاحب افسانہ ہی مستفید ہونا پسند فرمائیں گے، یہ بات بھی ان کے علم میں لائی جائے گی کہ آپ فنکار کی تخلیق کا معیار پرکھنے کے لئے کیا طریقہ کار استعمال کرتے ہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولے، مگر اس ادبی ہستی نے جو کسی سے سیدھے منہ بات کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے، لپک کر مرزا صاحب کا ہاتھ تھام لیا اور پھر انہوں نے جس انداز میں مرزا صاحب کی خوشامدیں کیں، وہ ہم بیان نہیں کر سکتے، بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہیر پکڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔

بہر حال مرزا صاحب بڑی دیر بعد جا کے پسیجے، اور خالص کاروباری انداز میں سودے بازی کرنے لگے۔ انہوں نے فکری صاحب کے ناول کے ساتھ ادارے کے طرز عمل پر سخت مکتہ چینی کی اور مطالبہ کیا کہ ان کے ناول اور افسانوں کے مجموعہ کا دوبارہ مطالعہ کیا جائے جسے بلا چون و چرا تسلیم کر لیا گیا۔

اور پھر فکری صاحب کا ناول اور افسانوں کا مجموعہ یکے بعد دیگرے شائع ہوتے ــــ ادہر وہ افسانہ مع چوٹی کے ادیبوں کی آراء کے مرزا صاحب کی تحویل میں تھا جس کو حاصل کرنے کے لئے جنا وری ادیب کافی عرصہ تک ان کے گھر کا چکر لگاتے رہے ادبی کتب خانہ کچھ عرصہ تک کام کرتا رہا، پھر ورکنگ کمیٹی میں ردوبدل ہوا، ارکین میں اختلافات پیدا ہو گئے، ایک دوسرے پر بے جا اخراجات کے الزامات عائد کئے گئے، منیجر صاحب پر کتابوں کی خرد برد کا الزام لگا ــــ اور پھر نوبت بایں جا رسید کہ اسٹاف کے لوگوں کی تنخواہوں کے لالے پڑ گئے۔ اُدھر بینک والے اپنے قرضہ کی وصولی کے لئے کوشاں تھے، معاملہ اتنا بڑھا کہ قانونی طور پر کتب خانہ بینک والوں کے حوالے کرنا پڑا ــــ نتیجہ ــــ "کتب خانے کو حاسدوں کی نظر کھا گئی"۔

سنہ ۱۹۷۱ء

●

"فیشن پرستوں سے معذرت کیساتھ"

• تفضل صاحب

یہ وہ جامہ ہے

تفضل صاحب

تفضل صاحب ہمارے پڑوسی تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ انتہائی مطلب پرست اور چلتے ہوئے آدمی ہیں اور اپنی ذات کے آگے کسی کو مقدم نہیں سمجھتے۔ مگر ہم تو صرف ان کی فیشن زدگی سے نالاں رہتے تھے۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ ان کے بال پیچھے سے انس حد تک بڑھے ہوئے ہیں کہ ان پر کسی مہ جبیں کی زلفوں کا گمان گذرتا ہے۔ نہ ان کی قلموں پر کبھی معترض ہوئے تھے جو گالوں پر اس طرح پھیلی ہوئی تھیں جیسے مکڑی کا جالا۔ ہم نے ان کے سوٹ پر بھی کبھی انگلی نہیں اٹھائی جو ان کے جسم پر یوں منڈھا رہتا تھا جیسے بدن پر رکھے رکھے سی دیا گیا ہو۔ ہمیں ان سے گلہ تھا تو صرف یہ کہ وہ فیشن پر ہمیں کیوں بور کرتے ہیں۔ اس سے ہمیں انکار نہیں کہ وہ ہمارے

پڑوسی تھے۔ اور پڑوسی کے کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں مگر یقین مانیئے ۔ ہم نے حقوق العباد پر کئی مستند کتابیں پڑھ ڈالیں مگر ان میں یہ کہیں نظر نہیں آیا کہ کسی کو پڑوسی کے دکھ درد کے ساتھ ساتھ اس کے فیشن میں بھی شریک ہونا چاہیئے۔

وہ نہایت سنجیدگی سے ہمیں فیشن کرنے کی تلقین کرتے، اس کے فوائد بتاتے، معاشرے میں فیشن پرستوں کو جو مقام حاصل ہے اس سے آگاہ کرتے۔ ان کے نزدیک فیشن سے بیگانہ شخص آدمیت سے خارج تھا اور ایسے شخص کو وہ معاشرے کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ سمجھتے تھے۔ ہم نے کئی بار دست بستہ عرض کیا کہ حضرت آپ کے ارشادات بجا، اگر مرنے سے پہلے کبھی اتنی فرصت ملی تو یقیناً ہم آپ کے ان اقوال زریں پر عمل پیرا ہونے کی سعادت حاصل کرینگے مگر للہ اب ہمارا پیچھا چھوڑیئے، ہم آپ کے فیشن کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں یہی بہت ہے۔ لیکن ہماری گذارشات کا اثر وقتی ثابت ہوتا۔

تفضل صاحب ایک مقامی فرم میں کیشیئر تھے۔ ایک کیشیئر کا زیادہ سے زیادہ مشاہرہ بھی اگر تصور کر لیا جائے تب بھی وہ فیشن جیسے مہنگے روگ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مگر شاباش ہے، تفضل صاحب کو، وہ اس قلیل آمدنی میں نہ صرف اپنے فیشن کا جنون برقرار رکھے ہوئے تھے بلکہ ہوٹل، کلب اور دیگر تفریحات میں بھی پابندی سے حصہ لیتے۔ لوگوں کو حیرت تھی کہ ایسا کیونکر ممکن ہے؟

مگر ہم جانتے تھے کہ اپنے اس جنون کی لاج رکھنے کے لئے انہیں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

تفضل صاحب غالباً صرف پہنو جگ بھاتا کے قائل تھے کیونکہ ظاہر ہے مسور کی پتلی دال اور اُبلے ہوئے خشک چاول ان کا من بھاتا کھانا ہونے سے رہا۔ جس پر وہ پچھلے کئی سالوں سے نہایت مستقل مزاجی سے قانع تھے۔ ان کی میز پر ان دو چیزوں کے علاوہ کوئی تیسری چیز دیکھنے کی حسرت ہی رہی۔ ان کا قول تھا "چاہے آدمی ایک وقت فاقہ کرے مگر قمیص کا کالر بے داغ رہنا چاہیئے"۔

شروع شروع میں جب ان پر فیشن کا حملہ ہوا تھا، انھوں نے اپنی پس انداز کی ہوئی رقم سے خوب بلبوسات بنائے اور خوب پہنے۔ خوب دکھائے۔ مگر جب فیشن بدلا تو موصوف سوچ میں پڑ گئے کہ اب کہاں سے کپڑے بنوائیں۔ اب تو ان کے ہاتھ میں صرف ان کی ماہانہ تنخواہ تھی اور بس۔ حسب دستور اپنی پریشانی سمیت ہمارے پاس آن دھمکے اور ہم سے مدد چاہی۔ ہم نے خطرہ بھانپ لیا، ہمیں یقین تھا کہ اس گفتگو کی "تان یقیناً قرض پر ٹوٹے گی۔ چنانچہ انہیں مشورہ دیا کہ بجائے نئے کپڑے بنوانے کے وہ انہیں کپڑوں کو نئے فیشن کے مطابق آلٹر (alter) کروالیں کہ یہ نسخہ آسان بھی ہے اور کم خرچ بالانشین بھی۔ اس پر وہ مایوسانہ انداز میں بولے۔

"بھئی۔ میں اس سلسلے میں اپنے درزی سے مشورہ کر چکا ہوں، اس

کے خیال کے مطابق ڈھیلے کپڑوں کو تنگ کرنا تو ممکن ہے مگر تنگ کپڑوں کو
دوبارہ ڈھیلا کرنا اس کے بس سے باہر ہے۔"

"اوہو، یہ تو بہت بُرا ہوا، — اس کمبخت فیشن کو بھی آج ہی
تبدیل ہونا تھا —" ہم نے قدرے خفگی کا اظہار کیا، پھر کچھ سوچ کر بولے،
اماں — بھئی، تو ایسا کیجئے نا — اپنی کمپنی سے کچھ رقم قرض لے لیجیے، اور
نئے کپڑے بنوا ڈالیئے۔ مگر اس بار اپنے درزی کو خاص ہدایت کیجیئے گا، کہ
وہ ملبوسات کو فٹنگ کے لئے تراشنے کے بجائے جوں کا توں رہنے دے اور ان
جگہوں پر پلیٹیں دے کر کپڑے کو دبا دے، تاکہ وقت ضرورت انہیں بدلتے
ہوئے فیشن کے مطابق تبدیل کیا جا سکے۔"

یہ ترکیب سُن کر وہ پھڑک اُٹھے اور ہمیں گلے سے لگا لیا — اب سوال
درزی کی رضامندی کا تھا۔ ہمیں توقع نہیں تھی کہ وہ اس پر راضی ہو جائے
گا اور یہی ہوا بھی۔ اس قسم کی دردسری میں پڑنے سے اس نے صاف انکار کر دیا
اور وہ ایک بار پھر منہ لٹکائے ہوئے ہمارے پاس دوڑے چلے آئے۔ کہنے لگے،
"بھئی، وہ تو راضی ہوتا نہیں، ذرا تم ہی چل کر اس کوڑھ مغز کو سمجھا دو۔"

ہم نے جواباً کہا، "مگر جناب، درزی آپ کا ہے ہم کیسے سمجھا دیں، اور
ہماری وہ کیوں سننے لگا۔"

"پھر بتاؤ کیا کروں آجکل فیشن کچھ اس تیزی سے بدلتے ہیں کہ ہر بار

ایک نیا سوٹ سلوانا تقریباً ناممکن ہے۔ سوچ رہا ہوں، کوئی پارٹ ٹائم نوکری کر لوں۔ مگر پھر شام کی تفریحات کا کیا ہوگا۔"

غرض کہ وہ بڑے مخمصے میں تھے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اس وقت تک نہیں ٹلیں گے جب تک ہم ان کی الجھن دور نہ کر دیں۔ چنانچہ ہمیں درزی کو سمجھانے پر راضی ہونا پڑا۔ ان کے در پر حاضر ہوئے اور بہ مشکل تمام انہیں اس کام پر تیار کیا۔ پہلے تو وہ انکار کرتے رہے اور کہتے رہے کہ صاحب ایسا بھی کبھی ہوتا ہے۔ اگر آپ کے حالات اجازت نہیں دیتے تو فیشن کرنا کسی حکیم نے نسخہ میں تو نہیں لکھا۔ مگر جب ہم نے ان کی ماہرانہ تراش اور خوبصورت سلائی کی تعریفیں کرنی شروع کیں اور انہیں خاندانی درزی ٹھہراتے ہوئے، ماہر فن ثابت کیا، تب حضرت پگھلے اور یہ بات اصولی طور پر تسلیم کر لی کہ ایسا ممکن ہے۔ کام میں ہاتھ ڈالنے پر پھر بھی رضامند نہیں ہوئے۔ تب ہم نے ماہانہ تنخواہ کی پیشکش کی اور یقین دلایا کہ انہیں ہر ماہ ایک معقول رقم بطور تنخواہ ملتی رہے گی۔ خواہ کسی ماہ انہیں زحمت دی جائے یا نہ دی جائے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ماہ زیادہ کام آجائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی دو ماہ تک فیشن تبدیل نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس فراخدلانہ پیشکش کو کوئی بے وقوف ہی ٹھکرا سکتا تھا۔ اور یوں ہم نے ان کی پریشانی رفع کر دی۔

کچھ دنوں بعد ایک نئی پرابلم سمیت وارد ہوئے۔ یعنی اب دو تین مخصوص

سوٹوں کو ادل بدل کر پہنتے ہوئے عاجز آگئے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ ان کے فیشن کی دھاک کے ساتھ ان کے بڑے پن کی دھاک بھی بیٹھی رہے، دوسرے الفاظ میں وہ چند نئے سوٹ بنوانا چاہتے تھے۔

ہم نے سوچا کہ یہ محض بہانہ ہے، حقیقتاً وہ نئے کپڑے سلوانے کے چکر میں ہیں، ظاہر ہے ایسی صورت میں وہ قرض مانگتے ہیں اپنی ازلی بے تکلفی کا ثبوت دیتے۔ لہٰذا ہم نے فوراً ایک حل پیش کیا: "ارے تو پریشانی کی کیا بات ہے۔ ایسے تمام سوٹ رنگوا ڈالیے۔"

"رنگوا ڈالوں ــــ" وہ منہ بسور کر بولے۔ "مگر بھئی رنگ کر کپڑے کی آب و تاب جاتی رہتی ہے۔ نہیں بھئی، یہ نہیں چلے گا۔ کوئی اور ترکیب بتاؤ۔"

"یہ محض آپ کا خیال ہے۔ ورنہ ہمارے شہر میں ایسے ایسے کاریگر موجود ہیں جو نہایت نفاست سے کپڑے کا رنگ بدل دیتے ہیں۔ عام آدمی قریب سے دیکھ کر بھی نہیں بتا سکتا کہ یہ کپڑے کا اصل رنگ ہے کہ نہیں۔"

"واقعی" وہ حیرت سے بولے، کسی ایک کا پتہ بتاؤ۔ میں بھی ذرا دیکھوں کہ وہ حقیقتاً کیسا کاریگر ہے۔ ٹسٹ کیے بغیر اسے کپڑے نہیں دے سکتا۔"

اس پر ہم نے وقتی طور پر پیچھا چھڑانے کی خاطر یونہی دو ایک رنگریزوں کے نام دے دیے کہ فی الحال ٹلیں، اتنے کوئی دوسری ترکیب سوچیں گے۔

مگر جب دوبارہ ملاقات ہوئی تو ان کے جسم پر رنگا ہوا سوٹ تھا، یہ

بتانے کی ضرورت نہیں کہ کیسا لگ رہا ہو گا۔ مگر ہم نے ان کی دلجوئی کی خاطر کہا۔ "بھئی واللہ۔ یہ نیا سوٹ کب سلوایا۔ اس پر وہ فخریہ انداز میں بولے

"بھئی نیا نہیں ہے، رنگوایا ہے۔"

"نہیں —" ہم نے خواہ مخواہ آنکھیں پھاڑیں۔ "ہرگز نہیں — یہ تو ایک دم نیا معلوم ہو رہا ہے۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے، — مگر بھئی آخر اس سے کب تک کام چلے گا۔ ظاہر ہے کہ کچھ دنوں بعد یہ بھی پرانے ہو جائیں گے۔ کوئی ایسی دیرپا ترکیب سوچو۔ جس میں خرچ بھی نہ ہو اور کام بھی چلتا رہے۔"

پتہ نہیں وہ ہمیں ترکیبوں کی کوئی مشین سمجھتے تھے یا ہمیں چت کرنے کی فکر میں تھے۔ کہ ادھر ہم چت ہوں اور ادھر وہ قرض کی فرمائش کر ڈالیں، مگر ہم نے ہتھیار ڈالنے نہیں سیکھے۔ فوراً بولے، "اس کی تو ایک ہی ترکیب ہے۔ آپ کچھ اپنے ہم قامت و ہم جسامت دوست تلاش کیجئے جو آپ کی طرح فیشن کے دلدادہ ہوں — اور ساتھ ہی ان کی آمدنی بھی محدود ہو۔ اس قسم کے اگر آپ نے دو دوست بھی پیدا کر لیے تو پھر ساری مشکل ہی آسان ہو جائے گی۔ آپ تینوں ایک دوسرے کے کپڑے پہنیے اور موج کیجئے۔"

بھئی واہ — خوب اس طرف تو دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ میں کل ہی یوتھ کلب جا کر تلاش یار کا سلسلہ شروع کرتا ہوں۔ وہاں ہر قسم کے لوگ

آتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں وہاں ایسے کئی دوست بنانے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔

اس انوکھی ترکیب پر وہ اپنی از حد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے رخصت ہو گئے اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب کافی عرصہ تک سکون سے رہ سکیں گے۔

لباس وغیرہ کے معاملہ میں تو وہ ہم سے ترکیبیں معلوم کرتے تھے مگر ہوٹل اور کلبوں میں وہ اپنی صلاحیتیں بروئے کار لاتے۔ یعنی اپنی جیب پر بوجھ ڈالے بغیر وہ تمام تفریحات میں حصہ لیتے اور خوب ڈٹ کر کھاتے پیتے تھے۔ اس سلسلہ میں انہیں جو ڈرامہ کھیلنا پڑتا اس کی مہارت کی ہم بھی داد دیتے ہیں۔ یہ بات انہوں نے ہمیں خود بتائی کہ ایک تقریب کے دوران انہوں نے تین نوجوان صنعت کاروں سے دوستی گانٹھ لی تھی، وہ تینوں ملوں کے مالک تھے، اور پشتینی رئیس گنے جاتے تھے۔ تفضل صاحب نے، جو باتیں بنا کر دوسرے کو شیشہ میں اتارنے کے فن میں یکتا تھے، خود کو ایک کمپنی کا مالک ظاہر کیا، اس سلسلہ میں انہوں نے ساری تیاری پہلے ہی مکمل کرلی تھی۔ اپنے جعلی کارڈ ہر وقت جیب میں رکھتے تھے اس کے علاوہ ایسے موقعوں پر اپنے بٹوے میں محض دکھانے کے لئے بڑے نوٹ کافی تعداد میں رکھتے تھے (ظاہر ہے کہ یہ کمپنی کا مال ہوتا ہوگا، کسی دوست کا ایک عدد

کریڈٹ کارڈ بھی پرس میں کچھ اس طرح اُڑسا رہتا کہ نام والا حصّہ چھپا رہتا۔ انہوں نے پہلے دن تینوں کو کافی کی دعوت دے ڈالی، اور بل چکاتے وقت بٹوا نکالا، اور پھر اس طرح ٹٹولنے لگے جیسے دس کا نوٹ بڑے نوٹوں میں گھل مل گیا ہو۔ غرض کہ انہوں نے بٹوے کی اتنی نمائش کی کہ ان سب کو یقین ہو گیا کہ وہ واقعی کسی کمپنی کے مالک ہو سکتے ہیں۔ جب ذرا بے تکلفی پیدا ہوئی تو انہوں نے حسب دستور مکھن کا ڈبہ کھولا اور ان نوجوانوں کی پُرکشش شخصیت، اعلیٰ تجارتی 'قابلیت' اور پُراثر طرزِ بیان کے قصیدے پڑھنے شروع کیے۔ نہ صرف ان کی تجارتی خدمات کو سراہا بلکہ ان کی سات پشتوں کی ثناخوانی کر ڈالی۔ صحت و حرفت پر ان کے اَن گنت احسانات کو خراجِ تحسین پیش کیا، اور جب انہیں یہ یقین ہو گیا کہ اب وہ تینوں ان کے پنجہ سے نہیں نکل سکتے تب جا کر مکھن کا ڈبہ بند ہوا۔

گفتگو کے دَوران انہوں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ وہ لوگ عموماً کن ہوٹلوں اور کلبوں میں جایا کرتے ہیں، کس قسم کی تفریحات میں دلچسپی رکھتے ہیں، کس قسم کے لوگوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اب وہ ہر ہفتہ کسی نہ کسی ہوٹل یا کلب میں ان سے جا ٹکراتے۔ پوری طرح تفریحات میں ان کا ساتھ دیتے، خوب ڈٹ کر کھاتے پیتے، گپیں ہانکتے، اپنی خیالی کمپنی کے فرضی تذکرے بھی کرتے جاتے تاکہ وہ کسی شبہ میں مبتلا نہ ہوں۔ اس دوران انہیں موڈ میں رکھنے کے لئے ان کی تعریف

وتوصیف بھی جاری رہتی۔ یہ مدح خوانی اس وقت اپنے عروج پہ پہنچ جاتی جب
بِل چکانے کا وقت آتا۔ ایسے موقعوں پر ان کی دریا دلی اور خاندانی مہمان نوازی کے
تذکرے خصوصیت سے کئے جاتے، بہر حال، ہر بار بِل ان کا بٹوہ جیب سے
باہر آنے سے قبل ہی ادا ہو جاتا۔ تفضل صاحب اپنی کوششوں میں اس لئے اور
بھی کامیاب سمجھے کہ "بڑے لوگ" خوشامدانہ اور جھوٹی تعریفوں سے پر گفتگو
میں خصوصیت سے دلچسپی لیتے ہیں اور اپنے ساتھ ایک عدد خوشامدی مصاحب
رکھنا اپنے بڑے ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں۔ مگر تفضل صاحب کو اس کی مطلق
پرواہ نہیں تھی کہ لوگ انہیں کیا سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے فیشن اور تفریحات میں مگن تھے
اپنی خواہشات کی تکمیل کا یہ سستا نسخہ محض اس لئے چھوڑنے کو تیار نہ تھے،
کہ لوگ انہیں خوشامدی اور چاپلوس جیسے خطابات سے نوازتے ہیں۔

دنیا جو چاہے سمجھا کرے، تفضل صاحب اپنی محدود آمدنی کے باوجود
بڑے لوگوں کی شاہانہ عیاشی میں ان کے شانہ بشانہ حصہ لیتے رہے۔ دنیا والوں
کی آوازیں ان کے مشاغل پر اثر انداز نہیں ہو پاتیں۔

(۱۹۶۹ء)

•

یہ وہ جامہ ہے — !

ہم چست لباس کے شدید مخالف ہیں وہ یوں کہ اس کو پہن کر آدمی، آدمی نہیں رہتا بلکہ ایک ایسا لفافہ بن جاتا ہے جس میں گنجائش سے زیادہ اشیاء ٹھونس دی گئی ہوں — اس لباس کا ایک کمزور پہلو یہ بھی ہے کہ اسے پہننے کے بعد آدمی آزاد ہوتے ہوئے بھی مقید سا دکھائی دیتا ہے۔ اسے کوئی حرکت کرنے سے پہلے کئی بار سوچنا پڑتا ہے کہ حرکت کرے یا رہنے دے، ہو سکتا ہے کہ اسے مبالغہ تصور کیا جائے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس قسم کے لباس میں ملفوف ہو کر ہلنا جلنا ایک اذیت سے کم نہیں ہوتا۔

ہم کسی کو اس قسم کے لباس میں مبتلا دیکھ کر ہی بے چین ہو جاتے ہیں تو پہن کر ہمارے اوپر جو قیامت نہ گذرتی — کم تھی، ہمارے وہم و گمان

میں کبھی نہیں آیا تھا کہ کبھی اس بلائے بے درماں سے ہمارا بھی سابقہ پڑے گا، مگر وہ کہتے ہیں نا کہ غم روزگار، بڑی بری بلا ہے ـــــ یہ وہ کام کرانے پر مجبور کر دیتی ہے جس کے تصور سے بھی انسان دور بھاگتا ہے۔

ان دنوں ہم تلاش معاش میں سرگرداں تھے، مگر ہوتا یہ تھا کہ ہم ملازمت کے پیچھے بھاگتے اور ملازمت ہم سے بھاگتی ـــــ درخواستیں لکھتے لکھتے قلم کی کئی نبیں گھس گئیں، کئی قیمتی رائٹنگ پیڈز ختم ہو گئے مگر کسی ظالم نے پلٹ کر یہ جھوٹی تسلی بھی دینا گوارہ نہ کی۔ کہ بھائی درخواست مل گئی ہے، کچھ دن صبر کرو،

ہمارے ایک دوست ہیں راشد صاحب، فیشن کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ ہم انہیں "مریض فیشن" کہتے ہیں۔ نہ جانے کس طرح انہیں ہماری پریشانی کا علم ہو گیا۔ بہ مشکل تمام دوڑے ہوئے ہمارے پاس آئے۔ بہ مشکل یوں کہ انہوں نے ایک نہایت چست نیلون ٹانگوں پر چڑھا رکھی تھی۔

آتے ہی فرمانے لگے، "یار سنا ہے کہ تم نوکری کی تلاش میں ہو"

ہم نے اثبات میں سر ہلایا اور مغموم صورت بنا کر گردن جھکالی۔ تب بولے "ارے بندۂ خدا تو پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ تم نے مجھ سے تذکرہ کیوں نہیں کیا۔ میں اپنی کمپنی کے ڈائرکٹر سے کہہ کر کہیں نہ کہیں بندوبست کرا دیتا۔ میرے ان سے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ یار، یہ ذاتی کام

بھی خوب ہی ہوتے ہیں، بڑے لوگوں کو مٹھی میں رکھنے کا بہترین طریقہ ہے"

ہم نے جواب دیا "بھئی کئی بار تمہارا خیال آیا مگر تمہیں دیکھ کر ہمیں وحشت ہونے لگتی ہے۔ لہٰذا تمہارے پاس نہیں آئے ـــــ"

وہ چونک پڑے "کیا مطلب؟"

"بھئی ـــــ یہ تمہارا لباس ـــــ اسے دیکھ کر ہمیں اختلاج ہونے لگتا ہے، لہٰذا یہی بہتر سمجھا کہ تم سے دور رہیں ـــــ اچھی خاصی مصیبت میں گرفتار رہتے ہونا"

وہ قہقہہ مار کر یوں ہنس پڑے گویا ہم نے ان کی تفنن طبع کے لئے کوئی چٹکلہ سنایا ہو، پھر بولے "اچھا مذاق ہے ـــــ پسند آیا ـــــ مگر یہ اچھی طرح ذہن میں بٹھالو کہ اب غرارے نما پتلونوں کا زمانہ نہیں رہا ـــــ اب اس قسم کی پتلون میں آدمی اسمارٹ نہیں لگتا ـ اور یہ بھی سمجھ لو کہ کمپنیوں میں اسمارٹ نوجوان ہی قدر اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں"

"اگر ان کپڑوں میں آدمی اسمارٹ لگتا ہے تو ایسے اسمارٹ پن پہ ہزار بار لعنت ـــــ کل کو کہنے لگو گے کہ محض لنگوٹی میں آدمی حد درجہ اسمارٹ نظر آتا ہے۔ بھائی، اس فیشن کا کوئی بھروسہ نہیں ـــــ"

ہم نے ناک چڑھا کر کہا۔

"خیر ـــــ خیر ـــــ یہ طویل بحث ہے ـــــ میں کل ہی ڈائرکٹر صاحب

سے بات کرتا ہوں۔ کئی فرموں کے مالک ہیں، کہیں بھی تمہیں لگا سکتے ہیں۔ مگر یار ــــ انٹرویو میں تمہیں ذرا اچھا "شو" کرنا ہوگا۔"

"اس کی تم فکر مت کرو ــــ ہم انہیں دکھا دیں گے کہ ہم کیا ہیں۔" پھر وہ چلے گئے ــــ اور ہم سوچنے لگے کہ اگر وہ مریضِ فیشن نہ ہوتے تو کاہے کو ہمیں اپنے قلم پر کئی عدد نہیں نچھاور کرنا پڑتیں ــــ کیوں سڑکوں پر خوبصورت رائٹنگ پیڈ کی جستجو میں جوتے گھسنے پڑتے۔

اگلے دن شام کو راشد صاحب پھر وارد ہوئے اور آتے ہی یہ خوشخبری سنائی۔ "لو بھئی ــــ مبارک ہو ــــ منہ میٹھا کراؤ، تمہارا کام ہو گیا ہے ــــ میں نے ڈائرکٹر صاحب سے بات کرلی ہے اور وہ رضامند ہو گئے ہیں انہیں خود ایک اسمارٹ ینگ مین کی تلاش ہے ــــ میں نے تنخواہ کے متعلق پوچھا تو کہنے لگے کہ آدمی دیکھ کر دوں گا، سمجھ گئے نا ــــ اس سے کیا مراد ہے۔"

"سمجھ گئے ــــ" ہم نے بُرا سا منہ بنایا۔ "مگر اطلاعاً عرض کردیں کہ ہم کسی آدمی کو اسمارٹ اس کے لباس کی بنا پر نہیں ٹھہراتے۔"

"تمہارے ٹھہرانے یا نہ ٹھہرانے سے کیا ہوتا ہے جی ــــ ڈائرکٹر صاحب لباس سے ہی آدمی کی شخصیت پرکھنے کے عادی ہیں۔ اگر تم ڈھیلے ڈھالے لباس میں گئے تو پہلا ہی تاثر خراب پڑے گا اور تم جانتے ہو، پہلا تاثر،

آخری تاثر ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا میری صلاح یہی ہے کہ تم کم از کم لباس کی حد تک فیشن اپنا لو۔"

"یہ ناممکن ہے ___ اس جدید لباس کو پہننے سے بہتر ہے کہ آپ ہمیں کسی کنوئیں میں ڈھکیل دیں۔___" ہم نے بڑا کڑوا منہ بنایا اور راشد صاحب کچھ مایوس دکھائی دینے لگے۔ پھر بولے "اب تم خود ہی اپنی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہو ___ اتنا گولڈن چانس ہے کیریر بنانے کا ___ اور تم اسے تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو ___ یہ یاد رکھو کہ اگر تم اس غرارہ نما پتلون اور چائے پوشی نما کوٹ میں گئے تو اگر بڑا کرم کیا تو تمہیں کوئی معمولی سا دفتری کام دے دیں گے ___ اور بس ___"

"ورنہ کیا جنرل منیجر بنا دیں گے ___" ہم نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"جنرل منیجر نہ سہی ___ آفیسر گریڈ میں ضرور لے لیئے جاؤ گے ___ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو کہ تمہاری اس ہٹ دھرمی سے خود تمہارا کتنا نقصان ہو گا۔ آج کل ملازمتیں کہاں ملتی ہیں۔ اگر تم نے یہ موقع گنوا دیا تو تم سے بڑا بے وقوف شاید اور کوئی نہ ہو ___"

راشد صاحب کے سمجھانے پر ہم سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ "کہہ تو یہ صحیح رہے ہیں ___ نوکریاں واقعی نہیں ملتیں ___ خود ہماری مثال سامنے ہے۔ ہزاروں درخواستیں بھیجیں، کسی جگہ شنوائی نہ ہوئی ___ ساری بھاگ دوڑ

رائیگاں گئی۔ کئی سفارشیں بھی ناکام ثابت ہوئیں۔" مگر کچھ بھی ہو، نوکری کے حصول کے لئے تنگ لباس کی قید بڑی سخت اور ناقابل قبول تھی۔ بھلا لباس کا نوکری سے کیا تعلق ـــ! کام ہمیں کرنا ہے نا کہ ہمارے لباس کو ـــ

جب راشد صاحب نے دیکھا کہ ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے تو کہنے لگے" اچھا بابا ـــ تم جیتے اور میں ہارا ـــ مگر بھائی کم از کم انٹرویو میں تو یہ لباس پہن جانا، چاہے بعد میں نہ پہننا ـــــ دیکھو اب میں کچھ نہیں سنونگا ـــــ اور پھر ایک دفعہ پہننے میں ہرج ہی کیا ہے. میں چاہتا ہوں کہ ڈائرکٹر صاحب کے معیار پر پورے اترو تاکہ انہیں اپنا من پسند اسمارٹ ینگ مین مل جائے ـــ"

"چلو ـ اگر تم کہتے ہو تو ایک بار یہ تجربہ بھی سہی، تمہاری خاطر یہ لباس جسم پر چڑھا لیں گے، مگر مشکل تو یہ ہے کہ ہمارے پاس یہ نامعقول لباس ہے ہی نہیں۔"

"کوئی بات نہیں ـــ بازار چلو ـــــ کپڑا خرید کر درزی کو دیئے دیتے ہیں، دو تین روز میں سوٹ سل کر تیار ہو جائے گا۔"

القصہ بازار پہنچے، کپڑا خریدا ـــــ درزی کی دکان پر پہنچے، درزی ناپ لینے لگا تو ہمیں سخت تعجب ہوا کہ بھلا یہ ناپ کی کونسی قسم ہے ـــ

اس سے پہلے ہم کئی بار ناپ دے چکے تھے، مگر اس قسم کے ناپ سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ ذرا ناپ ملاحظہ ہو۔

کمر کا ناپ لینے کے بجائے کولھوں کا ناپ لیا۔ پھر ران ناپی، اور جب پنڈلی کا ناپ لینے کے لئے جھکا تو ہم سے صبر نہ ہو سکا ہم چڑ کر بولے،

"کیوں صاحب، یہ پنڈلی کا ناپ کسی خوشی میں لیا جا رہا ہے ——— کیا سوٹ کے ساتھ موزے بھی سینے کا ارادہ ہے؟"

موصوف فرمانے لگے "پنڈلی کا ناپ کون لے رہا ہے ——— موری کا ناپ ہے۔"

"کیا موری پنڈلی سے چپکی ہوئی ہوگی ———" ہم نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا، اس پر انہوں نے ہمیں گھورا۔ جیسے بات ناگوار گذری ہو، ——— ادھر ہمارے دوست نے ہاتھ دبا دیا اور ہم خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔

تیسرے دن راشد صاحب سوٹ کا پیکٹ اٹھائے ہوئے آن موجود ہوئے ـــ ہم نے جو دیکھا تو اسے اپنا سوٹ ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ ادھر راشد صاحب اسے ہمارے سر تھوپنے پر مُصر تھے ——— "اماں یار، تمہارا ہی ہے ——— پہن کر تو دیکھو ـــ"

"ارے بھئی کیا ہم نرے جاہل ہیں ——— اپنے ناپ کا کپڑا نہیں پہچان سکتے ـــ آپ کو یقیناً کسی دوسرے کے کپڑے دے دیئے ہیں ——— ایسا

عموماً ہو جایا کرتا ہے" ہم نے سر ہلا کر یقین دلانے کی کوشش کی۔

"بھئی، تم تو خواہ مخواہ پریشان کرتے ہو" وہ زچ آ جانے والے انداز میں بولے "کیا کپڑا انہیں دیکھ رہے ہو ـــــ"

ہم نے ایک بار پھر بنظر غائر اس کا معائنہ کیا اور آہستہ سے بولے "اچھا ـــ تو یہ وہی سوٹ ہے، جس کا ناپ ہمیں کچھ مضحکہ خیز معلوم ہوا تھا"

"ہاں... ہاں... بھئی، بالکل وہی ہے ـــ لو پہنو تو سہی ـــ"

انہوں نے پتلون نما چیز ہماری طرف بڑھائی، ہم نے اسے ہاتھ میں لے کر فضا میں نچاتے ہوئے حیران نظروں سے دیکھا، پھر بڑبڑانے لگے ـــ "اس کے پہننے کی کیا تیکنک ہے ــــ ذرا وہ بھی تو سمجھا دیجئے"

"اماں، تیکنک کیا ہوتی، بس پہن لو، جیسے پہنتے ہیں"

"وہ کس طرح بھلا ـــ! پائینچہ میں سے پیر کس طرح گذرے گا۔ آپ نے اس کا قطر ملاحظہ فرمایا ــــــ" ہم نے پائینچہ ان کی آنکھوں کے سامنے جھلاتے ہوئے کہا۔

"سب گذرے گا ــــ تم پہنو تو سہی ــــ" وہ خاصے جھنجلائے ہوئے تھے۔

ہم نے داہنے پائینچہ میں پیر ڈالا اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا یعنی پنجہ اس حصہ میں جا کر پھنس گیا جہاں گھٹنا ہوا کرتا ہے ــــ کھینچا تانی

سے کچھ اوپر چڑھ گیا، مگر موری کے نزدیک جا کر پیر بالکل اڑ گیا۔

"اب کیا کریں ـــ ہم تو پہلے ہی کہہ رہے تھے۔" ہم نے بے چارگی کے عالم میں راشد صاحب کی طرف دیکھا جو غور سے اس موری کو دیکھ رہے تھے۔

"کوشش کرو ـــ یہ کچھ چھوٹی بنا دی ہے اور تمہارا پنجہ ذرا اڑا ہے، دیکھو میں چڑھاتا ہوں۔" انہوں نے آستین سمیٹتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ہمارے پیر اور پتلون کے پائنچہ سے باقاعدہ لڑنے لگے ـــ کافی عرق ریزی کے بعد پیر کی انگلیاں نظر آنے لگیں، اس کامیابی پر راشد صاحب نے فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے ہم سے کہا۔

"دیکھا ـــ اسے کہتے ہیں تجربہ ـــ بس اب آنے ہی والی ہے، تم اوپر سے کھینچو ـــ میں نیچے سے زور لگاتا ہوں۔"

پھر ہم نے مل کر زور آزمائی شروع کی تب کہیں جا کر پورا پیر ظاہر ہوا۔ اور موری ٹخنوں پر جا کر یوں چپک گئی جیسے ربڑ کی بنی ہوئی ہو ـــ راشد صاحب کمر پر ہاتھ رکھ کر بڑے غور سے ہماری پتلون کو دیکھ رہے تھے اور کمر بھی دباتے جا رہے تھے جو جھکے جھکے اکڑ گئی تھی۔

"کیا اب آپ کی کمر دبانی پڑے گی ـــ" ہم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اماں ـــ نہیں ـــ اب دوسرا پائنچہ پہنو۔" وہ کچھ اس انداز میں بولے جیسے کراہ رہے ہوں۔

"مگر راشد صاحب ـــــ کل پھر اسی طرح کشتی لڑنی پڑے گی۔ ہمیں تو صبح کی زیادہ فکر ہے۔"

اس پر انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ پتلون پہنے پہنے سو جانا چاہیے۔ "ترکیب تو اچھی ہے، مگر اس کا پریس خراب ہو جائے گا۔" کہنے لگے "نہیں۔ نہیں۔۔۔ اس پتلون میں کریز دریز کا خیال نہیں کیا جاتا۔"

معلوم نہیں یہ بات حقیقت پر مبنی تھی یا پیچھا چھڑانے کے لئے کہدی تھی۔

بہر حال ہم نے مزید الجھنا مناسب نہیں سمجھا، اور دوسرا پائنچہ چڑھانے لگے، اب کیونکہ پہلے پائنچہ کا تجربہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس بار زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ـــ پتلون پہن لی۔ مگر سوال یہ تھا کہ اب کیا کریں ـــ؟ ہم ہر وہ کام کرنے سے معذور ہو چکے ہیں جس میں ٹانگوں کو خم کرنا پڑتا ہے ـــ پتلون نے دونوں گھٹنے اس بری طرح جکڑ رکھے تھے جیسے گھٹنوں کے آگے پیچھے کھپچیاں رکھ کر بینڈیج کر دی گئی ہو ـــ ایک بار کسی سلسلے میں ہماری ایک ٹانگ پر پلاسٹر چڑھایا گیا تھا ـــ کچھ وہی کیفیت اس وقت بھی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ اس وقت دونوں ٹانگوں پر پلاسٹر چڑھا ہوا محسوس ہو رہا تھا ـــ ہم نے اپنی دشواری کا ذکر راشد صاحب سے کیا تو کہنے لگے۔

"آہستہ، آہستہ چلو۔۔۔ پھر مشق ہو جائے گی۔"

ظاہر ہے، آہستہ آہستہ بھی ٹانگوں کو خم دیئے بغیر نہیں چلا جا سکتا تھا چنانچہ

ہم نے پھدک پھدک کر چلنا شروع کر دیا۔ اس طرح ٹانگوں کو موڑنا نہیں پڑا۔۔۔ پھر دھیرے دھیرے کھسکے اور رفتہ رفتہ چلنے لگے۔ مگر چلتے ہوئے اسی تکلیف کا احساس ہوتا جو شاید پلاسٹر کی موجودگی میں ہوتا ہو گا۔

اس مرحلہ کو طے کرنے کے بعد ہم نے کوٹ پہنا اور جیسے ہی بٹن لگائے، تو یوں لگا جیسے سینے پر بھی بینڈیج کر دی گئی ہو۔۔۔ الغرض وہ سوٹ پہن کر ہم دریا کو کوزے میں بند کرنے والے محاورے کی صداقت کے قائل ہو گئے۔ کوٹ اس قدر ٹائٹ تھا کہ عمل تنفس رک جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا، ہاتھوں کو حرکت دینے سے جب کپڑا کھنچتا تو سینہ پر ایک قیامت سی گزر جاتی، چنانچہ کوئی حرکت کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لیتے کہ واقعی ہاتھوں کو ہلانا ضروری ہے یا ویسے ہی کام چل جائے گا۔

"بھئی یہ لباس ہے۔۔۔ یا جیل خانہ، یعنی اپنی مرضی سے کچھ کر ہی نہیں سکتے"، ہم نے جھنجھلا کر کوٹ کے بٹن کھول دیئے۔

"مگر یہ تو دیکھو کہ تم کس قدر اسمارٹ لگ رہے ہو۔۔۔ میں تو چاہتا ہوں کہ تم ہر وقت اسی لباس میں رہو۔۔۔" وہ تعریفی نظروں سے ہمیں آگے پیچھے سے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"اس لباس کو پہننے سے بہتر ہے کہ آپ ہمیں کسی شکنجہ میں کسوا دیجیے۔۔۔ اس میں کم از کم حرکت تو نہیں کرنی پڑتی۔۔۔"

اس پر حسب معمول راشد صاحب ہنس دیئے ـــــ پھر ہمیں انٹرویو کے لئے کچھ گُر کی باتیں سمجھانے لگے جن کا استعمال ہمیں اگلے دن صبح کرنا تھا۔

خیر صاحب، دوسرے دن صبح اٹھے، منہ ہاتھ دھویا، ناشتہ کیا۔ پھر اخبار پر نظر دوڑائی۔ بے رونق کا وہ غلاف جو رات کو ٹانگوں پر چڑھایا تھا، اب تک موجود تھا۔ اب ہم کسی حد تک اس کے عادی ہو چکے تھے۔ جیسے جیسے وقت گذرتا جا رہا تھا، دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی، ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے، مگر نہیں ـــــ صرف ہاتھ ـــــ پاؤں کے پھولنے کی گنجائش کہاں تھی ـــــ یہ کیفیت انٹرویو کے خوف سے نہیں تھی بلکہ ہم ان بھیانک شکل جوتوں سے ڈر رہے تھے جن کی چونچیں کسی آدم خور گدھ سے زیادہ نوکیلی تھیں ـــــ ہم نے بے حد دماغ لڑایا مگر یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ اچھے خاصے جوتے کی شکل بگاڑ کر فیشن کی شان میں کس قسم کا اضافہ ہوتا ہے ـــــ اور یہ بھی سمجھنے سے قاصر رہے کہ اگر یہ جوتا ہے تو یقیناً انسانی پیر کے لئے بنایا گیا ہوگا مگر سوال یہ ہے کہ جب انسانی پیر کے پنجے کی شکل میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تو جوتے کو آگے سے نوکیلا بنا دینا کیا معنیٰ رکھتا ہے۔

جیسے ہی گھنٹے نے نو بجائے ـــ ہم اٹھ گئے۔ پہلے ٹائی باندھنے کا ناخوشگوار فعل انجام دیا۔ جوں توں کر کے کوٹ جسم پہ منڈھا ـــــ پھر ڈرتے ڈرتے اپنے نوکیلے جوتے اٹھائے اور کانپتے کانپتے اپنا دایاں پیر اندر رکھا۔ بمشکل تمام پیر اندر

ڈالنے میں کامیاب ہوئے، مگر اس دوران پیر کی انگلیاں ایک دوسرے پر چڑھ گئیں۔ ـــــ دونوں جوتے پہن کر جو ہم چلنے لگے تو انگلیاں اس بُری طرح کڑکڑائیں کہ درد کی ٹیسیں سارے بدن میں دوڑ گئیں ـــــ وہ بھی برداشت کر لیتے، لیکن جوتے کی ایڑیوں کا کیا کرتے جو اس قدر بلند اور نوکیلی تھیں کہ انگریز لیڈیوں کی بھی کیا ہوتی ہوں گی ـــــ اتنی اونچی ایڑیوں پر سیدھی طرح چلنا بے حد دشوار کام تھا ـــــ ذرا جوتے سے غافل ہوئے اور پیر رپٹا ـــــ خطرہ یہ تھا کہ کہیں پیر مڑنے سے موچ نہ آجائے اور ہم بالکل معذور ہو کر نہ رہ جائیں۔

اتنے میں راشد صاحب آگئے، ہمیں اس مصیبت میں گرفتار دیکھ کر مارے خوشی کے لپٹ پڑنے کو ہوئے تو ہم نے فوراً خطرے سے آگاہ کر دیا۔

"ہیں... ہیں... ہم سے نہ بھڑیئے گا، ورنہ آپ کے سمیت زمین پر پڑے ہوں گے۔ اس جوتے پر توازن قائم رکھنا ہمارے لئے ممکن نہیں ـــــ اگر آپ کے دفتر تک پہونچ گئے تو یہی غنیمت سمجھئے گا، واپسی میں تو انشاء اللہ جوتے بغل میں دبا کر آئیں گے۔"

"اچھا... اچھا... یہ وقت مذاق کا نہیں ہے ـــــ کافی دیر ہو گئی ہے، اب چل دو۔"

ان کا دفتر زیادہ دور نہیں تھا لہٰذا کسی سواری میں بیٹھنا حماقت ہوتی۔ پھر شاید ہی کوئی ٹیکسی یا رکشہ والا اتنی دور جانے کے لئے راضی ہوتا ـــــ اگر راضی بھی ہو جاتا تب بھی اس لباس کی موجودگی میں بیٹھنا ایک مسئلہ سے کم نہ تھا ـــــ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے۔

اے خداوندا! ـــــ ہمارے گناہوں کو معاف فرما ـــــ ہمیں ساتھ خیریت کے منزل مقصود پر پہونچادے۔

سڑک تک پہنچنے کے لیے تھوڑی سی کچی زمین پر چلنا پڑتا تھا۔ کچی زمین چونکہ ناہموار ہوتی ہے لہٰذا اس پر ایڑیاں رکھ کر چلنا ہمارے بس سے باہر تھا۔ چنانچہ پنجوں کے بل چلتے ہوئے سڑک تک آئے، مگر وہاں پہنچتے پہنچتے ہمارے پنجوں کا کچومر ہی تو نکل گیا ـــــ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ جوتے کے اندر ایک آدھ انگلی ضرور جھڑ گئی ہوگی ـــــ راشد صاحب کو جب ہماری تکلیف کا احساس ہوا تو انہوں نے کوئی سواری پکڑنے کے سلسلہ میں ہم سے مشورہ طلب کیا۔

ہم نے کہا " بھائی نیکی اور پوچھ پوچھ، ـــــ مگر مصیبت یہ ہے کہ آپ کی اس جدید فیشن کی مصیبت کی موجودگی میں ہم بیٹھ تو سکتے ہی نہیں ـــــ کھڑے ہو سکتے ہیں یا لیٹ سکتے ہیں ـــــ اور ابھی ابھی

سواری ایجاد نہیں ہوئی جس میں لیٹ کر سفر کیا جا سکے۔"

اس پر انہوں نے ہمیں یوں گھورا جیسے ہماری دماغی حالت پر شبہ کر رہے ہوں ـــــ چار و ناچار پیدل ہی چلتے رہے ـــــ فٹ پاتھ پر چلنا قدرے آسان تھا۔ ہم نہایت سوچ سمجھ کر قدم اٹھا رہے تھے اور چلنے کے دوران اپنا توازن برقرار رکھنے کے لئے دونوں ہاتھوں کو دائیں بائیں سے گردش بھی دیتے جا رہے تھے ـــــ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بازیگر رسّی پر چلنے کا کرتب دکھا رہا ہو۔

راشد صاحب ہماری اس حرکت پر خاصے برہم تھے اور چور نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھتے جا رہے تھے کہ کوئی ہمیں دیکھ تو نہیں رہا ہے، جب کچھ راہگیر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں دیکھتے ہوئے قریب سے گذرے تو انہوں نے غرّاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "بھئی ـــــ یہ کیا حماقت ہے آدمیوں کی طرح چلو نا۔"

"بھائی اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے اگر جوتوں سے ذرا بھی غافل ہوئے تو زمین پر پڑے ہوں گے ـــــ یا ٹخنہ اُتار کر چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے ہوں گے ـــــ اب جیسی آپ کی صلاح ہو ـــــ"

اس پر ہمارے دوست بڑے خونخوار انداز میں گھورنے لگے، پھر بولے "اچھا ـــــ پھر میں تو جا رہا ہوں، ـــــ تم آتے رہنا ـــــ

—— پھر دوڑنے کے انداز میں روانہ ہو گئے۔

ظاہر ہے کہ ہم تیز رفتاری کا مظاہرہ نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا اسی رفتار اور اسی انداز میں چلتے رہے۔

ان کے دفتر پہونچنے کے لئے سیڑھیاں بھی طے کرنا ہوتی تھیں اور یہ سب سے نازک مرحلہ تھا کئی بار ہم لڑکھڑائے —— دو ایک دفعہ پیر بہکا اور ایسا لگا جیسے ٹخنہ اتر گیا ہو —— اوپر پہونچتے پہونچتے ہمارے دونوں ٹخنے بالکل بے کار ہو کر رہ گئے —— اب ایک قدم بھی اٹھانا دوبھر تھا —— ہم بہ دقّت تمام ان کے دفتر میں داخل ہوئے اور باہر بچھی ہوئی ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ اتفاق سے وہ اس طرف آنکلے اور ہمیں دیکھ کر شرارت آمیز لہجہ میں بولے۔ "اچھا —— تو آپ آگئے، امید تو تھی نہیں کہ آج پہنچ جائیں گے —— خیر —— بیٹھئے —— میں ذرا ڈائرکٹر صاحب سے مل آؤں۔"

"ٹھہریئے —— ذرا جانے سے پہلے —— ہمارے ٹخنوں کی مالش تو کر دیجئے اب ہمارے لئے ایک قدم اٹھانا بھی ممکن نہیں —— ہو سکتا ہے ہمیں کرسی پہ اٹھوا کر ڈائرکٹر صاحب کے سامنے پیش کرنا پڑے —— فیشن کرایا ہے تو نتائج کا بھی سامنا کیجئے۔"

یہ سن کر ہمارے دوست راشد صاحب ہکّا بکّا رہ گئے۔

(۱۹۶۵ء)

مرزا صاحبان سے معذرت کے ساتھ

- کھانے دعوت ہم بھی گئے
- فلم کا بخار

کھانے دعوت ہم بھی گئے

ایک شہر میں رہتے رہتے طبیعت اُکتانے لگی تھی، ہم نے سوچا کہ کیوں نہ باہر نکلا جائے مگر کہاں جائیں۔ گنے چنے تفریحی مقامات دیکھ دیکھ کر اُکتا گئے تھے۔ کافی سوچ بچار کے بعد سعید آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ یہ ایک طرح سے ہمارا وطن تھا، پہلے ہم وہیں رہتے تھے ہمارا بچپن اور جوانی سعید آباد ہی میں گذری تھی ـــ اس شہر میں ہم محض ملازمت کی مجبوری کی وجہ سے مقیم تھے۔

سعید آباد ہمارا ۱۲ برس کے بعد جانا ہو رہا تھا ـــ ہمیں یقین نہیں تھا کہ ہم وہاں اپنے جگری یاروں سے مل سکیں گے کیونکہ معلوم ہوا تھا کہ اب وہاں کوئی بھی نہیں رہا۔ سب اپنے اپنے کاموں کے سلسلے میں، ملک کے

دوسرے علاقوں میں پھیل گئے تھے، مگر اس کے باوجود ہم نے سعید آباد کو منتخب کیا تھا۔ یار نہیں رہے تو کیا ہوا ــــ وہ گلیاں، وہ کوچہ و بازار تو اپنی جگہ موجود ہیں جہاں ہم نے اپنی زندگی کا سنہری دور گذارا تھا ــــ ماضی کی وہ خوش گوار یادیں تو اس شہر کے در و دیوار سے وابستہ ہیں جنہیں ہم اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ تصور کرتے ہیں۔

القصہ ــــ ہم سعید آباد پہونچے ــــ خوب گھومے پھرے۔ کبھی بازاروں میں تو کبھی کھیتوں میں ــــ ایک ایک گلی کوچہ چھانتے پھرے ــــ یہاں کچھ جان پہچان والے بھی ملے، جن سے پتہ چلا کہ مرزا صاحب اب تک سعید آباد میں ہی ہیں۔ ــــ مرزا صاحب ــــ یہ جانیے ــــ ہمارے یار غار تھے اور کسی زمانے میں دوستی کا یہ عالم تھا کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھے بغیر چین نہ آتا تھا ــــ دن بھر ساتھ گھومتے پھرتے گپیں ہانکتے اور رات کو شطرنج و تاش کی محفلیں جماتے، ــــ ہمیں یہ سن کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ اب تک سعید آباد سے چپٹے ہوئے ہیں۔ گمان غالب تھا کہ اور دوستوں کی طرح وہ بھی تلاش معاش کے سلسلہ میں سعید آباد کو خیرباد کہہ چکے ہوں گے ــــ یہاں ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ مرزا صاحب میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں وہاں یہ خامی بھی تھی کہ آپ حد سے زیادہ کنجوس واقع ہوئے تھے ــــ دوستوں کی دعوت کرنا تو کجا۔

سگریٹ اور پان پیش کرنے میں بھی از حد تکلف سے کام لیتے تھے البتہ خود ہر تقریب اور ہر دعوت میں مدعو بے مدعو پیش پیش ہوتے تھے۔

کافی تلاش و جستجو کے بعد ہم انہیں تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے حضرت ایک کپڑے کی دوکان میں ملے، ___ شاید وہاں حساب کتاب کی دیکھ بھال ان کے ذمہ تھی ___ ہمیں دیکھ کر پہلے تو ٹھٹکے پھر بے اختیار لپٹ گئے ___ اور لگے شکوے شکایت کرنے۔

"یار بڑے بے مروّت نکلے ___ پلٹ کر دیکھا بھی نہیں کہ مرزا زندہ ہے یا مر گیا ___ اب بارہ سال کے بعد آئے ہو، تو وہ بھی بغیر اطلاع کے ___ تُف ہے تم پر ۔"

"مگر بھئی مرزا صاحب ___ ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ بھی اور لوگوں کی طرح یہ شہر چھوڑ چکے ہوں گے ۔"

"سب کو ایک جیسا کیوں سمجھتے ہو ___ تمہیں تمہاری کوٹھیاں، فلیٹ اور کاریں مبارک ہوں ___ میرے لئے تو یہ دیہات نما شہر ہی جنت ہے۔ یہاں کی گلیاں، بازار، کھیت اور ندیاں میری زندگی ہیں ___ انہیں چھوڑ کر میں شاید زندہ نہ رہ سکوں ___" وہ کافی جذباتی ہونے لگے تھے لہٰذا ہم نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ پھر قیام گاہ کے بارے میں دریافت کیا۔ کہنے لگے ___ "بھئی اسی مکان میں رہتا ہوں ___

جس کے دالانوں میں خس کی ٹٹیاں لگی ہوتیں اور جن کے پیچھے ہم دونوں پہروں بیٹھے خوش گپیاں کیا کرتے تھے ـــــ اس کی دوپہریں اور راتیں شاید تمہارے ذہن سے محو نہ ہوئی ہوں۔ ـــــ یاد ہے نا ـــــ"؟

"کیا واقعی ـــــ ہم نے حیرت سے کہا" کیا وہ مکان اب بھی صحیح و سالم موجود ہے ـــــ ہمارا خیال ہے وہ تو کافی خستہ حال تھا ـــــ"

"نہ صرف موجود ہے بلکہ اب تو اس کی شان کچھ اور بڑھ گئی ہے، اس کے آس پاس کے سارے مکان ڈھے چکے ہیں، اس محلہ میں صرف میرا ہی مکان رہ گیا ہے ـــــ میونسپٹی والوں نے بہتیرا زور لگالیا مگر میں اپنی جگہ جما ہوا ہوں۔ ـــــ اور کیسے چھوڑ دوں ـــــ میرا آبائی مکان ہے ـــــ دادا مرحوم نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اس کی بنیادیں رکھی ہیں ـــــ بھائی لوگ کہتے ہیں کہ مکان مخدوش ہو گیا ہے فوراً خالی کر دینا چاہیئے، ـــــ میں کہتا ہوں کہ جب مجھے کوئی فکر نہیں تو پھر وہ لوگ کیوں میرے غم میں گھلے جا رہے ہیں ـــــ میں تو اسی مکان میں دفن ہونا پسند کروں گا۔"

"بھئی، آپ بڑے ضدی ہیں ـــــ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مکان اب تک کھڑا کیسے ہے ـــــ کیا مرمت وغیرہ کرائی ہے ـــــ" ہم نے پوچھا ـــــ

"مرزا کے جیتے جی اسے کیا ہو سکتا ہے ـــــ دولت نہیں ہے ورنہ دوبارہ ایک شاندار حویلی کی شکل میں تعمیر کراتا ـــــ دلیسے بڑی ترکیبوں سے سنبھال رکھا ہے ـــــ یہ میرا ہی بوتا ہے جو وہاں ٹکا ہوا ہوں ۔"

"اچھا بھئی ـــــ یہ سب چھوڑیئے ـــــ اب یہ بتایئے کہ اپنے ہاتھ کی پکی ہوئی بریانی کب کھلا رہے ہیں۔ واللہ مرزا صاحب ترس گئے ہیں آپ کے ہاتھ کی بریانی کھانے کو ـــــ !"

مرزا صاحب بولے" بریانی ـــــ صرف بریانی ـــــ اماں، میں تو باقاعدہ دعوت کرنے کی سوچ رہا تھا مگر مکان کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ کسی شریف آدمی کو بلا کر بٹھا سکوں۔ وہاں تو داخل ہونا ہی ایک لاینحل مسئلہ ہے۔"

"بس... بس... پھر وہی حیلے بہانے ـــــ ایسا بھی کیا ہے خواہ مخواہ اپنے مکان کو ہوّا بنا رہے ہیں ـــــ ہمیں مکان و دکان سے کوئی غرض نہیں ہے، ہمیں تو بریانی کھانی ہے ـــــ چاہے اس کے لئے پُل صراط سے ہی کیوں نہ گذرنا پڑے "

"اچھا، خیر سوچیں گے ـــــ ابھی تو رہو گے نا ۔"

"سوچنا وچنا کچھ نہیں ـــــ ہم کل آرہے ہیں ـــــ ۔"

"اماں کل ـــــ نہیں بھئی ـــــ اتنی جلدی بھی کیا ہے ۔"

"اب کیا تمام عمر یہاں بیٹھے رہیں گے ـــــ ہم کل صبح سیدھے آپ

کے پاس پہنچ رہے ہیں، بس آگے کچھ نہیں سُنیں گے ـــــ" یہ کہہ کر ہم نے خدا حافظ کہا اور وہاں سے فوراً چل دیئے کیونکہ ہمیں ڈر تھا کہ کہیں وہ کوئی بہانہ نہ بنا دیں ـــــ بہانہ تراشنے میں ان کا ثانی نہیں تھا۔

مرزا صاحب کے ہاتھ کی بریانی صرف چند ہی خوش نصیبوں نے چکھی ہو گی ـــــ اور ہمیں فخر ہے کہ ہم بھی ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہیں۔ ـــــ وہ خود تو کیا چکھاتے ـــــ ایک بار ہم خود ہی بغیر اطلاع ان کے مکان میں چلے گئے تھے۔ (یہ واضح کرتے چلیں کہ مرزا صاحب کنوارے تھے اور بالکل تنہا رہتے تھے) کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت تخت پر آلتی پالتی مارے بیٹھے گرم گرم بریانی اڑا رہے ہیں ـــــ ہمیں دیکھ کر چونکے ـــــ مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنی اس مقوی اور تر غذا کے بارے میں کچھ "ارشاد" فرماتے ہم نہایت بے تکلفی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارنے لگے ـــــ بریانی اتنی لذیذ اور تر تھی کہ آج بھی یاد کر کے منہ میں پانی آجاتا ہے ـــــ ہمیں دیکھ کر وہ خاصے شرمندہ ہوئے کیونکہ باہر وہ ہر ایک سے اپنی ازلی تنگدستی کا رونا رویا کرتے تھے اور یہ جتایا کرتے تھے کہ بس روکھا سوکھا کھا کر گذارہ کرتے ہیں، لیکن اس وقت رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے ـــــ ان کی حالت یہ تھی کہ ہمارے یہاں دونوں تینوں وقت ڈٹ کر کھاتے ـــــ اور اگر اتفاق سے کسی روز ہم ان کے یہاں پہنچ جاتے تو

بس مٹھی بھر بھنے ہوئے چنے اور کورے مٹکے کے پانی پر اکتفا کرنا پڑتا ـــــ پان کی ایک گلوری مانگو تو دینے کے بجائے اس کے طبی، سماجی اور معاشی نقصانات گنانے بیٹھ جاتے اور کمال کی بات یہ ہے کہ حضرت نے خود اپنے زرد دانت اور سیاہ زبان دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

ہم نے سوچ لیا تھا کہ خواہ کتنا ہی بے شرم بننا پڑے اس دفعہ بریانی کھا کر ہی دم لیں گے ــــ اور پھر مرزا صاحب سے کیا تکلف، ہم ہیں اور ان میں فرق ہی کیا ہے

دوسرے دن ہم ان کے محلہ کی طرف جانکلے ــ جو کبھی محلہ رہا ہوگا، اب تو کسی شہر خموشاں کی تصویر بنا ہوا تھا ـــ ہمیں سخت تعجب ہوا کہ اس اجاڑ اور ویران جگہ، جہاں ہو کا عالم طاری ہے، وہ کس طرح رہتے ہوں گے ــ اور وہ بھی تنہا ہمارے زمانہ میں ہی یہ محلہ بہت کم آباد تھا اور زیادہ تر مکانات بوسیدہ ہونے کے سبب خالی کئے جا چکے تھے، اب تو ہر طرف کھنڈرات ہی دکھائی دیتے تھے، سڑکیں اور گلیاں ملبے سے ڈھک گئی تھیں ــ ہر طرف ایک پر ہول سناٹا اور وحشت ناک ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

اس علاقہ میں ان کا مکان تلاش کرنا بھی ایک کار دارد تھا۔ اول تو ہم جائے وقوع بھول گئے تھے دوسرے ایسی صورت میں جب کہ چلنے کے لئے کوئی باقاعدہ راستہ بھی نہ ہو، مکان ڈھونڈ نکالنا انتہائی دشوار تھا

مگراب تو آہی چکے تھے، چنانچہ ملبہ کے ڈھیروں کو پھلانگتے، مٹی کے تودوں سے خود کو بچاتے، نوکیلے پتھروں اور خاردار جھاڑیوں سے خود کو محفوظ رکھتے، آگے بڑھتے رہے۔ خدا کا شکر ہے کہ جلد ہی وہ ٹیلہ نظر آگیا جس کے قریب ان کی قیام گاہ تھی ـــــ مکان کیا اچھی خاصی حویلی تھی (یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے عزت ظاہر کرنے کے لئے اسے مکان ہی کہتے رہے ہوں) اس کا کافی حصہ کھنڈر میں تبدیل ہو چکا تھا، کچھ حصہ البتہ ابھی تک سالم تھا، لیکن مخدوش حالت میں ـــــ گرتے پڑتے صدر دروازے کے قریب پہونچے جس کے آگے کبھی چبوترا تھا مگر اب وہ ملبہ کا ڈھیر بن چکا تھا ـــــ ہم اس پر کھڑے ہو کر دروازے کو تک رہے تھے جس پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا۔

"خطرہ ـــ دستک دینا منع ہے"

چند لمحہ منہ پھاڑے عبارت کو "تکتے رہے ـــــ پھر ادہر ادُہر دیکھا مگر وہاں نہ آدم نہ آدم زاد ـــــ چاروناچار آواز دینے کی غیر اخلاقی حرکت کے مرتکب ہوئے ـــــ مگر دو تین آوازوں پر اُن کے کان پر جوں "تک نہ رینگی، تب ہم باقاعدہ شیر زبازار کے انداز میں چیخنے لگے ـــــ ہمارے "داویلا" پر اندر سے ان کی کچھ ایسی آواز آئی جیسے کنوئیں کے اندر سے بول رہے ہوں "اماں ـــ کون صاحب ہیں ـــــ" اس پر ہم نے اپنا نام بتایا۔

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر آواز آئی۔

"اچھا... اچھا... تو یہ تم ہو، ـــ تو کیا واقعی آ گئے ـــ سچ مچ مکان تلاش کرتے ہیں تو پریشانی نہیں ہوئی۔"

"اماں، مرزا صاحب ـــ یہ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے ـــ اجاڑ، ویران، سنسان، نہ آدم نہ آدم زاد ـــ اور یہ دروازے پر کیا لکھ چھوڑا ہے ـــ یہ کیا مذاق ہے۔"

"مذاق ـــ بھئی یہ مذاق نہیں ہے ـــ یہ ہدایت نمبر ایک ہے، میں نے کہا تھا کہ مکان کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ ایک عام آدمی مکان کو ضرر پہونچائے بغیر اندر داخل ہو سکے ـــ اب تم ہی سوچو ڈیڑھ صدی پرانا مکان ہے ـــ مرمت وغیرہ سے محروم ـــ اب یہ عمر کے اس حصہ میں داخل ہو چکا ہے جہاں اندر آنے اور باہر جانے کے کچھ قواعد و ضوابط وضع کرنے پڑتے ہیں ـــ لہٰذا اگر اندر آنا چاہو، تو جیسا کہتا جاؤں، ویسا کرتے جاؤ ـــ ہر قدم نہایت احتیاط سے رکھنا ہوگا۔ پوری یکسوئی اور توجہ کے ساتھ ہدایت سنو اور عمل کرو ـــ ذرا سی لغزش پورے مکان کے لئے خطرہ بن سکتی ہے۔ میں اس وقت غسل کر رہا ہوں ورنہ خود حاضر ہوتا ـــ۔"

ہم منہ پھاڑے ان کی باتیں سُن رہے تھے ـــ دل ہی دل میں

سوچنے لگے کہ کہیں ان کا دماغ تو نہیں چل گیا ہے ۔۔۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی ۔۔۔ اندر داخل ہونے کے قواعد و ضوابط ، ہونہہ ۔۔۔ حماقت ۔"

"سمجھ گیا سوچنے لگے ۔۔۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ یہ عام آدمی کے بس کا کام نہیں ہے ۔ تم ذرا دوکان چلو ، میں وہیں پہنچ رہا ہوں ۔"

"نہیں بھئی ۔۔۔ ہم کوئی ڈرپوک ہیں ۔۔۔ ہاں ، بتایئے پہلے کیا کرنا ہے ۔"۔۔۔ ہم نے اکڑ کہا ۔ دل میں کہہ رہے تھے " بیٹا ۔۔۔ ہم آسانی سے ہار ماننے والے نہیں ہیں ۔۔۔ تم لاکھ ڈراؤ ۔۔۔ اگر آج بریانی نہ کھائی تو کچھ بھی نہ کیا ۔۔۔"

" اچھا ، تو تم باز نہیں آؤ گے ۔۔۔ خیر ۔۔۔ تو بھائی سنو ، اپنا داہنا قدم نہایت احتیاط اور مضبوطی کے ساتھ دروازے کی چوکھٹ پر جماؤ ۔"

ہم نے اپنا داہنا پیر دروازے کی چوکھٹ پر رکھ کر کہا ،" چلو رکھ لیا ۔۔۔ اب ؟"

" انپی شہادت کی انگلی سے داہنے پٹ کو ہلکا سا دھکا دو ۔۔۔ پورا پنجہ استعمال نہ کرنا ، ورنہ پٹ گر پڑے گا ۔"

ہم نے ایسا ہی کیا ۔۔۔ دروازہ کھل گیا تو مرزا صاحب کو مطلع کیا ، کہنے لگے ۔

"اب داہنے قدم کو چوکھٹ پر سے ہٹائے بغیر بایاں قدم اندر لاؤ۔ ذرا سنبھل کر ـــــ داہنا قدم ہٹنے نہ پائے ـــــ سمجھے، شاباش"

ہم نے ہدایت پر عمل کیا، مگر سوچ رہے تھے کہ عجیب مصیبت ہے۔ اگر بریانی کھانے کے بعد اس قسم کی ورزش سے دوچار ہونا پڑا تو کھایا پیا سب برابر ہو جائے گا۔

"اچھا ـــــ اب بائیں پٹ کو سیدھے ہوئے بغیر پیچھے کی جانب ہلکے سے دھکا دو اور داہنے پٹ کو دبائے دبائے سیدھے ہو جاؤ ـــــ اس طرح کہ قدم چوکھٹ پر سے ہٹنے نہ پائے ـــــ ذرا احتیاط سے کرنا ـــــ ورنہ چوکھٹ تمہارے سر پر گرے گی ـــــ بھئی، ڈیڑھ سو سال پرانا مکان ہے، اس کی چوکھٹ ٹکی ہوئی ہے، یہی غنیمت ہے ـــــ (کچھ وقفہ بعد) کیوں بھئی کیا رہا ـــــ"

"ہو گیا ـــــ" ہم نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "بھئی، مرزا صاحب ـــــ آخر آپ کوئی دوسرا مکان کیوں نہیں لے لیتے ـــــ یہ تو بھوت خانہ معلوم ہوتا ہے۔"

"بھئی تم بھی کمال کرتے ہو ـــــ اپنا آبائی مکان کس طرح چھوڑ سکتا ہوں اور پھر میرے حالات بھی تم جانتے ہو، ـــــ بس اب چوکھٹ سے پیر ہٹا لو ـــــ کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

ہم نے ڈرتے ڈرتے چوکھٹ پر سے پیر ہٹایا اور وہ ذرا سی ہل کر رہ گئی ــــ مڑ کر دیکھا تو خود کو ایک تاریک راہداری میں کھڑا پایا ــــ جس میں جا بجا بانس اور لکڑی کی بلیاں لگا کر غالباً چھت کو سہارا دیا گیا تھا ــــ یہ لکڑیاں اتنی قریب لگائی گئی تھیں جیسے زیر تعمیر مکان میں لگی رہتی ہیں ــــ ان کے درمیان سے نکلنا بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہم بے چارگی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ کہیں کوئی راستہ مل جائے تاکہ ہم ان بھول بھلیوں سے چھٹکارا پا سکیں، مگر کوئی جگہ ان سے خالی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر بھی نظر آ رہے تھے، بلیوں میں جا بجا مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے ــــ ہم نے رومال سے پسینہ خشک کیا ــــ اور بے بسی سے ہاتھ ملنے لگے۔

"اماں کیا ہوا، ــــ کیا ہمت ہار بیٹھے؟" ان کے شرارت آمیز طرز تخاطب پر ہمیں غصہ آگیا چنانچہ جھلا کر بولے۔ "نہیں ــــ" کچھ دیر بعد ان کی آواز آئی۔

"اب تمہیں ذرا اپنی مہارت کا ثبوت دینا ہوگا ــــ تمہارے عین سامنے مختلف اقسام کی لکڑی کی بلیاں ہیں ان میں سے دو، اوروں کی بہ نسبت زیادہ موٹی ہیں بس انہیں کے درمیان سے ذرا مڑے ہو کر کھسکتے ہوئے اندر آ جاؤ ــــ مگر خبردار .... خبردار .... کسی بلی سے جسم مس

نہ ہونے پائے ورنہ خیر نہیں ہے — بس زیادہ سے زیادہ دس قدم چلنا ہوگا اس کے بعد کوئی مشکل نہیں ہے۔"

ہم نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سوچنے لگے کہ خواہ مخواہ مصیبت میں پھنسے ہیں، واپس چلتے ہیں، جہنم میں گئے مرزا صاحب اور ان کی بریانی — یوں جان خطرے میں ڈالنا کہاں کی دانشمندی ہے — مگر ہمت ہار کر واپس ہونا ہماری انا کے لئے باعثِ توہین تھا۔ چنانچہ ہم یہ مرحلہ بھی طے کرنے کے لئے تیار ہو گئے — آڑے ہو کر دو موٹی بلیوں کے درمیان آنے کو جو ہوئے تو ہمارے آگے نکلے ہوئے پیٹ نے ایسا ہونے سے باز رکھا۔ چکرا گئے — اب کیا کریں — ؛ مرزا صاحب تو خیر دُبلے پتلے آدمی تھے، نکل جاتے ہوں گے، مگر ہم اپنے پیٹ کے فاصل حصّہ کو کہاں لے جائیں۔ مجبوراً سانس روک کر پیٹ اندر کیا اور ہمت کر کے تھوڑا سا کھسکے دل ہی دل میں لرز رہے تھے کہ کہیں بلّی سے نہ ٹکرا جائیں، درمیان میں سانس ٹوٹنے لگا۔ ایک تو گرمی دوسرے ٹکرا جانے کا خوف، ہم سانس لینے کا ارادہ ہی کر رہے تھے معاً خیال آیا کہ پیٹ باہر نکلا تو بلّی سے ٹکرا جائے گا اور پھر موت کا تصور آتے ہی ہمارا سانس اندر کا اندر ہی رہا، خدا خدا کر کے راہداری ختم ہوئی اور ہم صحن میں آ گئے۔ یہاں آ کر ہم نے ایک گہرا سانس لیا اور پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئے۔ جو اندر کی جانب کھنچے کھنچے اینٹھ گیا تھا — چند لمحہ ساکت

بیٹھے حواس مجتمع کرتے رہے ـــــ پھر کراہتے ہوئے اُٹھے ـــــ صحن کسی زمانے میں ضرور صحن ہوگا مگر اب منوں خاک، کوڑا کرکٹ اور ملبے کے نیچے دفن تھا ہم نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو وہاں کوئی آگے جانے کی راہ سجھائی نہیں دی ـــــ اتنے میں مرزا صاحب کی آواز سنائی دی۔

"بس، اب بائیں جانب والے دالان میں آجاؤ ـــــ یہاں ذرا تاریکی ضرور ہے مگر راستہ صاف ہے۔ اور ہاں، دالان کے کسی ستون کو نہ چھیڑنا، بڑی مصیبت سے اینٹوں کو جمایا ہے اگر ایک ہی بھی اپنی جگہ سے کھسک گئی تو پوری عمارت کو لے بیٹھے گی ـــ"

ہم نے کچھ کہے سُنے بغیر بائیں جانب نظریں گھمائیں تو ملبہ کے ڈھیر کے پیچھے دالان کا در نظر آیا۔ بہ دقّت تمام ڈھیر پر چڑھے اور لڑھکتے پھڑکتے دالان میں جا پڑے ـــــ ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اچانک اندر سے ایک سیاہ رنگ کی خونخوار بلی نے ہم پر حملہ کر دیا ـــــ ہم بوکھلائے ہوئے تو تھے ہی، بِدک کر بھاگے، مگر اتنا ہوش رہا کہ کسی ستون سے نہیں ٹکرائے ـــــ لیکن بلّی اپنا کام کر چکی تھی، نہ صرف پتلون کا دایاں پائنچہ پھاڑ لے گئی بلکہ اپنے نوکیلے پنجوں کے سرخ نشانات بھی پنڈلی پر چھوڑ گئی ـــــ ہم اپنی زخمی پنڈلی دیکھنے کے لئے جھُکے تو وہ دوبارہ حملہ آور ہونے لگی، بچاؤ کی کوشش میں ہم اوندھے منہ کوڑے کے ایک ڈھیر پر جا گرے ـــ ہمیں گرتا دیکھ کر وہ غرّا کر

رُک گئی۔ اتفاقاً ہمارے ہاتھ میں ایک پتھر آگیا، جو اس پر کھینچ مارا۔۔۔۔۔ اور وہ چیاؤں میاؤں کرتی ہوئی ملبے کے ایک ڈھیر کے پیچھے غائب ہو گئی۔

"اماں ۔۔۔۔ کیا ہنگامہ بپا ہے ۔۔۔۔ کس پر پتھراؤ ہو رہا ہے؟"

"بلی تھی ۔۔۔۔ کالی بلی ۔۔۔۔" ہم نے ہانپتے ہوئے کہا اور اپنی خراشوں پر رومال رکھ کر سی سی کرنے لگے۔

"آہیں ۔۔۔۔ یہ بدبخت کہاں سے ٹپک پڑی ۔۔۔۔ کل ہی تو اسے اسٹیشن پر چھوڑ کر آیا تھا ۔۔۔۔ کہیں چوٹ ووٹ تو نہیں آئی ۔۔۔"

"پتلون کا پائنچہ لے گئی ۔۔۔۔ پنڈلی زخمی کر دی"

"چہ ۔۔۔ چہ ۔۔۔ افسوس صد افسوس ۔۔۔۔ آج اس کمبخت کو ٹھکانے ہی لگا دوں گا ۔۔۔۔ کئی بار مجھے بھی زخمی کر چکی ہے ۔۔۔"

ہم بمشکل تمام اٹھے ۔۔۔۔ دل ہی دل میں مرزا صاحب کو برا بھلا کہہ رہے تھے ۔۔۔۔ کپڑوں کی گرد جھاڑی اور لنگڑاتے ہوئے آگے بڑھے پنڈلی میں سخت مرچیں لگ رہی تھیں اور ادھر مرزا صاحب مسلسل ہدایات جاری کئے جا رہے تھے ۔۔۔۔ فلاں جگہ سے فلاں طریقے سے گذرو ۔۔۔۔ فلاں دالان میں ملبے کے اوپر تختے رکھ کر جو اونچی گذرگاہ بنائی گئی ہے اس پر نٹوں کے انداز میں ہاتھوں کے توازن سے آہستہ آہستہ آگے بڑھو ۔۔۔ فلاں جگہ گندے پانی کا جو قطعہ ہے اس کے درمیان پتھر رکھ کر جو راستہ بنایا

گیا ہے۔ ان کو سہلاتے ہوئے خشکی پہ آؤ ــــ وغیرہ وغیرہ

نہ جانے کتنی آزمائشوں کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ موصوف بالاخانے پہ تشریف فرما ہیں، اسی جگہ ایک نہایت کھلا سڑا بوسیدہ سا لکڑی کا زینہ تھا، بقول مرزا صاحب اس کے ذریعہ ہمیں اوپر پہنچ کر ان کے حضور حاضر ہونا تھا ــــ ہم نے زینہ دیکھا تو پوچھا۔

"بھئی مرزا صاحب، ــــ یہ زینہ تو ہمارے بوجھ سے گر پڑے گا ــــ اس کے تو انجر پنجر ڈھیلے ہو رہے ہیں ــــ لکڑی کو بھی دیمک چاٹ گئی ہے۔"

فرمانے لگے "اگر بے احتیاطی کرو گے تو یقیناً گر پڑے گا ــــ لیکن اگر ہدایات کی پابندی کی تو نہایت سکون سے اوپر آ جاؤ گے ــــ"

ہم نے نہایت بے دلی سے 'ہوں' کہہ کر رضامندی ظاہر کی ــــ اور اس سلسلہ میں ان کی اولین ہدایت کے منتظر رہے۔

"ہاں، بھئی تیار ہو نا ــــ"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ کچھ کہیے بھی ــــ" ہم نے چڑ کر کہا اور دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کرنے لگے کہ محض زبان کے چٹخارے کی خاطر ہم اپنی زندگی سے کھیل رہے ہیں۔

اتنے میں اوپر سے آواز آئی۔" زینہ کے جنگلے کا سہارا لے کر تیسری

سیڑھی پر براہ راست قدم رکھو ــــ لیکن پہلی دوسری پر ہرگز قدم نہ رکھنا ورنہ ہم ذمہ دار نہیں۔ جنگلے پر تمہارا بوجھ عمودی پڑنا چاہیئے ورنہ یہ جنگلہ فریم سے جدا ہو کر تمہارے ساتھ زمین پر پڑا ہوگا۔"

ہم نے پسینہ سے تر پیشانی پونچھی اور بے چارگی کے عالم میں اوپر دیکھا اور بسم اللہ کر کے جنگلے کو پکڑا۔ پھر دایاں پاؤں پھیلا کر تیسری سیڑھی پر رکھا ــــ اور بہ مشکل تمام ہاتھوں پر زور دے کر اوپر اٹھے۔ پھر چشم زدن میں تیسری سیڑھی پر جا پہنچے ــــ اوپر پہنچ کر دائیں ٹانگ میں اچانک شدید تکلیف کا احساس ہوا، ہم نے ٹانگ ہلانی چاہی تو درد کی لہریں بے ساختہ کراہوں میں بدل گئیں۔ شاید ٹانگ کی کوئی رگ کرتب کے دوران چڑھ گئی تھی ــــ ہم بے اختیار اپنی ٹانگ سہلانے لگے ــــ درد کی شدت سے ہمارا برا حال تھا ــــ سارا بدن پسینہ سے تر ہو رہا تھا، ذرا سی حرکت سے یوں لگتا جیسے جان نکل رہی ہو ــــ ہم بے دم سے ہو گئے۔

"اب بے دھڑک تین زینے چڑھ آؤ ــــ مگر چوتھے پر قدم نہ رکھنا" اوپر سے آواز آئی۔ وہ اس سے قطعی بے خبر تھے کہ ہم پر کیا قیامت گذر گئی۔

ہم نے کسی نیم مردہ انسان کی طرح بایاں پیر اوپر رکھا اور دائیں کو اوپر لانے لگے تو درد کی ایک ٹیس سارے بدن میں دوڑ گئی۔ کراہ کر واپس آگئے ــــ ذرا سی حرکت ناقابل برداشت تھی۔ کچھ دیر کسی تھکے ہوئے خچر کی طرح ہانپتے

رہے پھر جس عالم میں وہ سیڑھیاں طے کیں ہم ہی جانتے ہیں۔ مارے تکلیف کے نیم بے ہوش سے ہو گئے۔

ادہر مرزا صاحب ہر چیز سے بے نیاز اگلا حکم صادر فرما رہے تھے، "اب جنگلہ پکڑ کر اپنے ہاتھوں پر اوپر کی جانب اٹھو اور اس طرح اگلے زینہ پر آؤ کہ دونوں پیر بیک وقت رکھے جائیں اس طرح توازن بگڑنے نہیں پائے گا ___ اس سیڑھی پر جو تختہ نظر آرہا ہے وہ میں نے بعد میں رکھا ہے، یہ تختہ فریم سے جڑا ہوا نہیں ہے، اگر ذرا بے احتیاطی کی تو نتیجہ تم جانتے ہی ہو ___ چلو شاباش ___"

ادہر ہماری یہ حالت تھی کہ ٹانگ کو جنبش دینا ہی عذاب الٰہی سے کم نہ تھا ___ چہ جائیکہ ہم نٹوں کی طرح تماشا دکھاتے ___ سوچنے لگے کہ نہ جانے کس منحوس گھڑی ہم نے سعید آباد کا قصد کیا تھا ___ اور وہ کون منحوس دن تھا جب مرزا صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ کاش ہم ان سے نہ ملتے کم بخت نے اگلا پچھلا تمام حساب ایک ہی دن میں بے باق کرالیا۔

ہم نے اوپر کی جانب دیکھا، ابھی تیرہ چودہ سیڑھیاں طے کرنا باقی تھیں ___ دل ہی دل میں مرزا صاحب کو ستر میل فی گھنٹہ رفتار سے گالیاں دیتے ہوئے اٹھے، دونوں ہاتھ جنگلے پر رکھ کر خود کو بہ دقت تمام اوپر اٹھایا تھوڑی دیر آگے پیچھے جھول کر اگلے زینہ پر دونوں قدم ایک ساتھ رکھے ___

جیسے ہی دائیں ٹانگ پر زور پڑا ہم درد کے مارے بلبلا گئے، ظاہر ہے چڑھی ہوئی رگ اس قسم کے کرتبوں کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی اور اپنے اس پر ذرا احتجاج میں حق بجانب تھے ۔۔۔ بہر حال اس کے احتجاج کے بعد ہم کھڑے نہ رہ سکے اور زینہ پر ہی بیٹھ رہے، سارا بدن پسینہ میں نہا گیا تھا، درد کی شدت سے سر چکرانے لگا تھا ۔۔۔ ٹانگ کی کیفیت الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے، بس یہ سمجھ لیجیے، دکھتا ہوا پھوڑا ابھی اس سے بہتر ہوگا ۔۔۔ ادھر مرزا صاحب کی آواز ہمارا خون کھولا رہی تھی۔

"میاں، ۔۔۔ بس یونہی جھولتے جھالتے اوپر آجاؤ ۔۔۔ بڑی لاجواب کثرت ہے ۔۔۔ اوپر آکر خود کو بڑا چاق و چوبند پاؤ گے۔ یہاں میں تمہارے لئے کوئی شایان شان اہتمام تو نہیں کر سکا، ویسے رات میں فجو بھڑ بھونجے کے یہاں سے سوندھے سوندھے چنے بھنوا لایا تھا ۔۔۔ کیا بتاؤں رات کیسے نہک رہے تھے ۔۔۔ ابھی تک اثر باقی ہے ۔۔۔ اوپر آؤ تو چکھاؤں۔ اماں، تم تو ترس گئے ہونگے ۔۔۔ شہر میں اس قسم کے چنے بھلا کہاں ملتے ہوں گے اور پھر اوپر سے کورے گھڑے کا ٹھنڈا پانی ۔۔۔ بس اب جلدی سے آجاؤ تو دستر خوان فرش کروں ۔۔۔"

یہ سن کر تو ہمارے تلووں میں لگی اور سر پر بجھی ۔۔۔ جی چاہا کہ اوپر جاکر مرزا صاحب پر پل پڑیں اور جب تک ان کی ہڈی پسلی برابر نہ کر دیں، نہ

چھوڑیں، ___ ہمیں ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ اتنے عرصہ بعد ملاقات ہونے پر بھی وہ اس قسم کا مزاق کریں گے ___ اگر وہ پہلے ہی اپنے اس عظیم اہتمام کا ذکر کر دیتے تو ہمیں اتنی مشقت کاہے کو کرنی پڑتی ___ مگر ہم اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر تھے، ایک تو ٹانگ کی کیفیت، دوسرے اوپر پہونچنا ہی ناممکن تھا ___ ادہر ہمارا ذہن "انتقام، انتقام" چیخ رہا تھا، ___ ہم نے سوچا کہ اب واپس ہی چلنا بہتر ہوگا ___ چنانچہ تمام ہدایات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے لڑھکتے پھڑکتے نیچے پہنچے، ___ ہماری بے احتیاطی کے نتیجہ میں زینہ ملتے ہوئے دانت کی مانند لرزنے لگا۔ تھا ___ آگے بڑھنے سے پہلے ہم نے انتقامی کارروائی کے طور پر زینہ میں لگی ہوئی دو ٹلیاں جو اسے سہارا دے رہی تھیں، الگ کر دیں ___ زینہ اور بری طرح کانپنے لگا ___ ہم نے سوچا بس اتنا ہی کافی ہے، مگر تشفی نہ ہوئی اور جاتے جاتے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر پوری زور سے زینہ پر دے مارا ___ زینے کے گرنے کی آواز میں مرزا صاحب کی چیخ و پکار دب کر رہ گئی ___ جب ہم دروازے سے گذر رہے تھے تو صرف اتنا سُن سکے۔

"ارے ظالم ___ یہ کیا کیا ___ زینہ گرا دیا ___ یاد رکھنا اگر میرے دشمنوں کو شمہ برابر گزند پہونچا تو . . . . یہ خون تمہاری گردن پر ہوگا ___ ہائے بے موت مرگیا ___"

(۱۹۶۷ء)

فلم کا بخار

مرزا صاحب اچھے خاصے مذہبی انسان تھے، روزے نماز کے پابند، مذہبی مسائل میں طاق، ایک مٹھی اور تین انگل کی شرعی داڑھی کے مالک — ایک دن ہم سینما کیا دکھا لائے ان کی تو کایا ہی پلٹ گئی۔

ڈاڑھی صاف کرا ڈالی، بال انگریزی طرز پر ترشوا لیے — شیروانی کی جگہ چست پتلون اور آدھی آستین کی ٹی شرٹ نے لی — ایک تو بیچارے ڈھائی پسلی کے آدمی اوپر سے بے ہئیت کذائی، کسی سرکس کے مسخرے معلوم ہوتے تھے — لیکن کسی میں اتنی ہمت کہاں کہ ٹوک دیتا —

صاحبِ حیثیت اور صاحب اقتدار تھے — کافی جائیداد تھی، خوش دل اور فیاض آدمی تھے — آج تک کسی کی درخواست رد نہیں کی، سفارش

ور مالی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے، یہی وجہ تھی کہ لوگ ان کی دل و جان سے عزت کرتے تھے۔

مرزا صاحب ہمارے بڑے بھائی کے دوستوں میں سے تھے، لہذا ہم ان کی بڑی عزت کرتے تھے ہم نے انہیں کئی بار مختلف طریقوں سے سمجھانا چاہا کہ "قبلہ ___ آپ اس قسم کے لباس میں کچھ زیادہ بھلے معلوم نہیں ہوتے، اگر تبدیلی کے ہی خواہاں ہیں تو بہتر ہو گا کہ کوئی دوسرا معقول لباس تجویز فرمائیں، تاکہ وہ مہیا کیا جائے ___ مگر ان پر 'فلمیریا' کا بڑا زبردست حملہ ہوا تھا، فرمانے لگے،

"تم میرے اس لباس پر کیوں معترض ہو، آخر وہ عجیب کمار ایسا لباس کیوں پہنتا ہے۔"

ہم نے جواباً عرض کیا، "حضور وہ فلمی دنیا ہے، وہاں یہ سب کچھ چلتا ہے، ___ لیکن روزمرہ زندگی میں اس قسم کے لباس کو شریفانہ نہیں سمجھا جاتا۔"

کہنے لگے "تو صاحبزادے بلند اقبال ___ مجھے کب یہاں رہنا ہے، میں بھی عنقریب فلمی دنیا میں آباد ہونے والا ہوں ___ بس تم مجھے تھوڑی سی ٹریننگ دے دو تو میں اس عجیب کمار کو بتاؤں کہ حقیقتاً اداکاری کسے کہتے ہیں۔"

ہم نے سُنا تو ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے، کیونکہ انہوں نے یہ بات کچھ اس سنجیدگی سے کہی تھی کہ ہمارے کچھ کہنے سننے کا شاید ہی کوئی اثر مرتب ہوتا ــــــ ہم نے دل ہی دل میں کہا۔

"اماں مرزا ــــــ یہ بڑھاپے میں آپ کو کیا سوجھی ــــ جوانی میں اگر خیال آیا ہوتا تب بھی غنیمت تھا ــــــ وہ زمانہ تو آپ نے روزے، نماز اور پرہیزگاری میں گذار دیا ــــــ اب اس پیری کو کیوں داغدار کر رہے ہو"

ایک دن کنگھا لئے ہوئے ہمارے پاس دوڑے آئے۔ "بھئی زحمت تو ہوگی ــــ ذرا عجیب کمار کے اسٹائل کے بال بنا دو، گھنٹوں سے کوشش کر رہا ہوں، مگر کمبخت بن ہی نہیں چکتے۔"

ہم چند لمحہ حیرت سے مرزا صاحب کا سرتاپا جائزہ لیتے رہے، جو تنگ مہری کی پتلون اور تولیے کی بنیان میں لپٹے ہوئے تھے ــــ لپٹے ہوئے یوں، کہ وہ دونوں چیزیں ریڈی میڈ تھیں ــــــ اور کوئی ریڈی میڈ کپڑا ان کے ناپ کا مرے سے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"بھئی حیرت سے کیا دیکھ رہے ہو ــــ تم خود اس قسم کا لباس نہیں پہنتے کیا؟"

"ج... جی... جی... جی ہاں... بالکل..." ہم ہکلانے لگے۔ "پھر ــــ اس میں حیرت زدہ ہونے کی کیا بات ہے۔"

"کچھ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ بھی نہیں ۔۔۔۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمیں توقع نہیں تھی کہ اس لباس میں آپ اس حد تک جچیں گے ۔۔۔۔" ہم نے بات بنادی اور وہ سینہ پھیلا کر یار کی طرف دیکھنے لگے، پھر بولے۔

"چلو بھئی ۔۔۔۔ سنبھالو، کنگھا ۔"

ہم نے طوعاً و کرہاً کنگھا لیا اور ان کے بال سنوارنے لگے، لیکن وہ کسی صورت بھی ہماری مرضی پر چلنے کو تیار نہ تھے، اور کیسے ہوتے، ساری عمر انہیں پیچھے کی طرف پڑے رہنے کی عادت ہو گئی تھی ۔۔۔ اب انہیں مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ عجیب کمار کے بالوں کے انداز میں پیشانی پر بکھر جائیں ۔۔۔۔ آخر تھک ہار کر ہم نے کہہ دیا۔ "مرزا صاحب یوں کام نہیں چلے گا، آپ تھوڑے سے ہیر پن منگوایئے دو تین دن لگائے رکھیے، تب کہیں جا کر یہ اپنی پرانی وضع بدلیں گے ۔"

فوراً ملازم کو ہیر پن منگوانے بازار دوڑایا ۔۔۔ ہم نے کبھی خواب میں بھی ہیر پن استعمال نہیں کئے تھے، مگر اب تو مشورہ دے چکے تھے لہٰذا اخلاصی کی کوئی صورت نہ تھی ۔۔۔ پن آئے تو الٹے سیدھے جیسے لگے لگا دیئے، اس دوران کئی بار جھنجھلا کر ہم نے تو ان کے سر میں بھی چبھائے، مگر مرزا صاحب کے منہ سے اُف تک نہ نکلی اور نکلتی بھی کیسے جب وہ عجیب کمار کو کوڑے کھا کر مسکراتے دیکھ چکے تھے، پھر وہ کیونکر اپنی کمزوری کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔

ایک دن ہم نے دیکھا کہ ہاتھ ہلا ہلا کر قدآدم آئینہ کے سامنے کھڑے بڑے جوش وخروش کے ساتھ تقریر کر رہے ہیں ـــ بہادر سپاہیو! امتحان کا وقت آن پہنچا ہے ـــ دشمن کی فوجیں ہمارے اوپر حملہ کرنے کے لئے تیار کھڑی ہیں، ہمیں تمہاری قوت، شجاعت اور بلند ہمتی پر ہمیشہ ناز رہا ہے، ـــ آج دشمنوں کو بتادو کہ تمہارے اوپر ہاتھ اٹھانے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے ـــ طوفان کی طرح اٹھو اور بجلی کی طرح دشمنوں کے سروں پر گرو ـــ یاد رکھو تمہارے سروں کو ہمیشہ کی طرح بلند رہنا چاہیے فتح انشاء اللہ ہماری ہوگی ـــ تمہاری مائیں، بہنیں اور بیویاں تمہارے استقبال کے لئے آنکھیں بچھائے کھڑی ہیں لہذا تمہاری واپسی فاتح شیروں کی طرح ہونی چاہیے ـــ ہارے ہوئے جواریوں کی طرح نہیں ـــ آگے بڑھو، اور دشمنوں کی صفوں کو تتر بتر کر ڈالو، اگر مارے گئے تو شہادت کا درجہ پاؤ گے اگر زیر ہو گئے تو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے جاؤ گے۔

اس تقریر کے بعد انہیں کچھ اتنا جوش آیا کہ وہ آئینہ سے بھڑ گئے اور لگے مکّے اور گھونسے رسید کرنے، لیکن آئینہ کافی مضبوط تھا۔ خود انہیں اپنے ہاتھ سہلانے پڑے۔ قبل اس کے کہ ان کی نظر ہم پر پڑتی، ہم چپ چاپ وہاں سے کھسک لئے، ـــ مگر وہاں سے کھسکنا ہمیں مہنگا پڑا۔ کیونکہ کچھ دیر بعد ہی تقریر دوبارہ ہضم کرنا پڑی اور خاتمہ پر ہمیں دشمن سمجھ کر مکّے اور

ہوئے، وہ تو خیریت ہوئی کہ ہم نے فوراً ہاتھ پکڑ لئے، ورنہ کئی عدد گھونسے ہمارے چہرے پر پڑتے۔

"ہاں بھئی نجمی! ــــ کیسے رہے یہ مکالمے۔" انہوں نے پوچھا۔

"بہترین .... ایکسیلینٹ ...." ہم نے تعریفی انداز میں آنکھیں گھمائیں۔

"بس تو جلدی سے ایک اچھے ہدایت کار کو خط لکھ دو کہ اگر ایک پائے کے ہیرو کی ضرورت ہے تو فوراً آ کر لے جائے ــــ ورنہ بعد میں پچھتانا پڑے گا۔"

"جی ...." ہم نے حیرت سے یوں آنکھیں پھاڑیں جیسے وہ پاگل ہو گئے ہوں۔

"ہاں ... ہاں ... حیرت کی کیا بات ہے ... مجھ میں کیا خامی نظر آتی ہے ...."

"خامی .... تو کچھ نہیں ہے، لیکن ... آپ ... آپ یعنی ہمارے بزرگ ... ہیرو ...."

"کیا کہنا چاہتے ہو، کیا میں ہیرو نہیں بن سکتا۔" انہوں نے غصہ میں کہا۔

"جی .... جی .. آپ ہیرو ... تو بالکل بن سکتے ہیں .. مگر .."

وہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ تلوار بازی اور گھوڑ سواری بھی تو آنی چاہیئے ــــ ہمارا خیال ہے کہ پہلے اس کی مشق کر لیجئے۔" ہم نے جلدی میں یہی بہانہ مناسب سمجھا کہ فی الحال تو جان چھوٹے، بعد میں نپٹتے رہیں گے۔

"ہاں۔۔۔ خوب یاد دلایا ــــ یہ ضروری ہے، عجیب کمار کم بخت بڑی اچھی تلوار چلاتا ہے، اور گھوڑ سواری میں تو گویا طاق ہے۔۔۔۔ اس کا گھوڑا ہمیشہ ہوا سے باتیں کرتا نظر آتا ہے۔۔۔ خیر ہم بھی کسی سے کم نہیں ــــ یہ بھی کر کے دکھا دیں گے ــــ" انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اگر ہم یہ بتا دیتے کہ گھوڑ سواری تو عجیب کمار کی سات پشتوں کو نہیں آتی، فلموں میں ایسے موقعوں پر ڈپلی کیٹ استعمال کئے جاتے ہیں تو بات وہیں آجاتی کہ ہدایت کار کو خط لکھوا کر لے جائے۔ چنانچہ ہم نے سکوت اختیار کرنے ہی میں عافیت جانی۔

مرزا صاحب کے جانے کے بعد ہم اطمینان سے لیٹ گئے، کہ چلو جان چھوٹی سو لا کھوں پائے۔۔۔۔ لیکن کہاں۔۔۔ کچھ دیر بعد وہ پھر آن دھمکے اب کے ان کے ہاتھوں میں کئی عدد تلواریں تھیں۔۔۔۔ ہماری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، اتنی جلدی یہ تلواریں کہاں سے آگئیں ــــ؟ پتہ چلا، کہ خاندانی تلواریں ہیں جنہیں انہوں نے شاید اسی دن کے لئے نہایت سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

"آؤ بھئی، تھوڑی سی تلوار بازی ہو جائے... اس بہانے تم بھی کچھ گر کی باتیں سیکھ جاؤ گے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"جی ــ مرزا صاحب، ہم، یعنی اب ہم تلوار لڑیں گے اور وہ بھی آپ سے ـــ"

"ہاں، ہاں... کیا مضائقہ ہے ـــ خون میں تھوڑی سی روانی آجائے گی ـــ اب اٹھو بھی۔"

مرتا کیا نہ کرتا، کے مصداق دل ہی دل میں مرزا صاحب کو صلواتیں سناتے ہوئے اٹھے، نہ جانے وہ کونسی منحوس گھڑی تھی جب ہم نے انہیں سنیما دکھایا تھا۔ ہم نے تلوار سنبھالی، بالکل اصلی تلوار تھی۔ دھار میں پہلی جیسی تیزی تو باقی نہیں رہی تھی پھر بھی اتنی تیز ضرور تھی کہ زخم ڈال دیتی۔ ہمارے دیوتا کوچ کرنے لگے۔

"مرزا صاحب، یہ تو بالکل اصلی ہے، اگر لگ گئی تو۔" ہم نے خوف زدہ لہجہ میں کہا۔

"لاحول ولاقوۃ، بالکل ہی ڈرپوک رہے نا، اماں ہم مشق کر رہے ہیں واقعی تھوڑا ہی لڑ رہے ہیں۔"

ہم خاموشی سے تلوار کو دیکھ رہے تھے، سوچ رہے تھے کہ اگر مرزا صاحب کے لگ گئی تو شاید اس دار فانی سے ہی کوچ کر جائیں۔ ہم خواہ مخواہ پھنسیں گے۔

چنانچہ بولے "مرزا صاحب، عجیب کمار سچ مچ کی تلوار سے تھوڑا ہی لڑتا ہے۔ وہ بغیر دھار والی ہوتی ہے، بالکل بے دھار والی۔ کُند۔"

"بہانے بازی نہیں چلے گی، سنبھلو، شمشیر زن حملہ آور ہوتا ہے،"

یہ کہتے ہی وہ غرا کر ہم پر جھپٹ پڑے، ہم نے اناڑیوں کی طرح تلوار سامنے کر دی۔ دونوں تلواریں ٹکرائیں اور باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی۔ مرزا صاحب جامے سے نکلے پڑ رہے تھے اور اچھل اچھل کر وار کر رہے تھے اور ہم کمزور پڑتے جا رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے زندہ وسلامت رہنے کی بھی دعائیں مانگ رہے تھے۔ اچانک انہوں نے ٹھوکر کھائی اور چاروں خانے چت زمین پر جا گرے۔ ہم نے پھرتی سے تلوار ان کی گردن پر رکھ دی۔ جی میں تو آیا کہ گھسا ڈالیں مگر اس کے انجام نے باز رکھا۔ وہ بہ مشکل تمام اٹھے، ہم نے فوراً کہا،

"آپ نے تو کمال ہی کر دیا — ہمیں توقع نہیں تھی، آپ تو ماہر تیغ زن ہیں۔ آپ کو مطلق مشق کی ضرورت نہیں ہے۔ جی ہاں۔"

"میاں بس ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو پیدائشی ہر فن مولا ہوتے ہیں۔"

انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"بجا ارشاد فرمایا۔ ہمارے تو چھکے چھوٹے جا رہے تھے، سمجھے تھے کہ آج خیر نہیں ہے۔"

وہ زیرِ لب مسکرائے، پھر بولے "تو سنبھالو قلم"۔ ہم نے جلدی سے کہا، لیکن مرزا صاحب وہ گھوڑ سواری ۔"

"ہاں۔ ہاں۔ خوب یاد دلایا ہمیں نے نوکر سے کہہ دیا ہے، صبح میدان میں گھوڑا مع زین تیار ملے گا، ہم صبح تمہیں اپنی گھوڑ سواری کے کمالات سے محظوظ کریں گے"۔ پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے شاگرد پیشے کی طرف چلے گئے اور ہم دل ہی دل میں لاحول پڑھتے ہوئے اپنی خوابگاہ کی طرف چلے آئے۔

دوسرے دن علی الصبح ہمیں ملازم نے آکر اٹھایا اور بتایا کہ مرزا صاحب باہر میدان میں یاد کر رہے ہیں۔ ہم نے ایک بار پھر لاحول پڑھی اور منہ ہاتھ دھوئے بغیر ہی باہر آ گئے کیونکہ اگر ذرا دیر لگاتے تو وہ خود آ موجود ہوتے۔

یہاں ایک ملازم گھوڑے پر زین کس رہا تھا اور مرزا صاحب قریب کھڑے اسے کچھ ہدایات دے رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے، ہمیں بھی جواباً زبردستی مسکرانا پڑا۔ جیسے ہی زین کسی گئی مرزا صاحب اچھل کر گھوڑے پر بیٹھ گئے۔ پھر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ ہم بھی ساتھ ہو لیے۔ مرزا صاحب کچھ اس طرح اکڑے بیٹھے تھے جیسے کسی فوج کا جنرل محاذ پر جا رہا ہو، ہم دل ہی دل میں ان کی ہیئت کذائی پر ہنس رہے تھے، گھوڑا پورے میدان کا چکر لگا کر رک گیا۔

"مرزا صاحب، گھوڑا دوڑائیے، تب بات ہے،" ہم نے حفظ کے اندیشے

سے خوفزدہ ہو کر جلدی سے کہا۔

"ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں۔ ہمیں تو ابھی گھوڑے کے مزاج دریافت کر رہا تھا ابھی لو۔" یہ کہہ کر انہوں نے گھوڑے کے دو تین زبردست ایڑیں لگائیں، ہم نے شڑاپ شڑاپ دو تین ہنٹر جڑ دیئے اور گھوڑا ہوا ہو گیا۔ ادھر مرزا صاحب کے ہوش و حواس گم تھے۔ وہ گھوڑے کی پشت پر سوار ادھر اُدھر جھول رہے تھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اب گرے اور تب گرے۔ آخر جب ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے تو انہوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ "ارے، ارے... روکو... یہ کمبخت تو گرائے دیتا ہے... دوڑو... دوڑو... مدد۔ ارے اگر گرا تو ہڈی پسلی برابر ہو جائے گی۔"

ہم دل ہی دل میں ہنستے ہوئے گھوڑے کے پیچھے لپکے، ملازمین بھی ہمارے ساتھ دوڑے مگر گھوڑے کی برابری کس طرح کر سکتے تھے، جو مرزا صاحب کو لئے سیدھا بھاگا جا رہا تھا۔

اب مرزا صاحب گھوڑے کی دائیں جانب لٹکے ہوئے جھول رہے تھے اگر ان کا پیر رکاب میں نہ پھنسا ہوتا تو شاید ان کی ہڈیوں کا پتہ بھی نہ چلتا۔ لگامیں وہ پہلے ہی چھوڑ چکے تھے، گھوڑا میدان چھوڑ کر ناہموار راستہ پر ہولیا، ادھر مرزا صاحب حلق سپھاڑ سپھاڑ کر چیخ رہے تھے۔ ہم نے راستہ میں کھڑی ہوئی ایک سائیکل اٹھائی اور گھوڑے کا تعاقب شروع کر دیا، مگر اچانک ان کا پیر رکاب سے نکل

گیا اور وہ کسی مردہ چھپکلی کی طرح اوندھے منہ زمین پر گر پڑے۔ ہمارے وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ بے ہوش ہو چکے ہیں۔ سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک نوکر کو گاڑی لانے دوڑایا اور اپنا رومال نکال کر ان کے سر پر باندھ دیا۔

گاڑی آئی، مرزا صاحب کو اسپتال پہونچایا، وہاں بتایا گیا کہ سر میں شدید چوٹ آئی ہے اور دو تین پسلیاں بھی چٹخ گئی ہیں۔ ویسے حالت خطرے سے باہر تھی۔ ان کی تیمارداری ہمیں ہی کرنی پڑی۔ کچھ بھی ہو، ان کی حالت قابل رحم تھی۔ کئی ہفتہ اسپتال میں پڑے رہے۔

تندرست ہو کر واپس ہوئے تو فلمی بخار اس طرح اُتر چکا تھا جیسے کبھی چڑھا ہی نہ ہو۔ داڑھی دوبارہ اُگنے لگی تھی، اور فلمی ملبوسات ملازمین میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔

(۱۹۶۵ء)

یہ بھی پڑھیے

- جائیں کدھر کو ہم
- یار زندہ
- دیتا اک لکچر کا
- ٹائیں ٹائیں فش

سیاسیات

جائیں کدھر کو ہم

ہمارے دیرینہ دوست اور کرم فرما مرزا صاحب کا مطالبہ تھا کہ ہم بلا تاخیر اس سیاسی جماعت کا نام بتائیں جس کے انتخابی منشور، بنیادی نظریات، اور مقاصد سے ہمیں اتفاق ہو، اور جو آنے والے انتخاب میں ہمارے قیمتی ووٹ کی مستحق قرار پا سکے۔ ہم نے انہیں یقین دلایا کہ سیاست سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں، نہ اب ہے نہ پہلے تھی۔ نہ آئندہ ایسا کوئی اندیشہ ہے۔ لہذا سیاسی جماعتوں اور ان کے نظریات کی چھان پھٹک ہمارے لئے مشکل کام ہے۔ البتہ ووٹ ڈالتے وقت ضرور غور کرلیں گے کہ کس کے حق میں ڈالیں۔

مرزا کے لئے معقول استدلال اور سچی بات کو تسلیم کرنا ذرا مشکل کام ہے اس لئے انہوں نے اصرار کیا کہ یہ ایک اہم اور نازک مسئلہ ہے اس پر ہمیں قطعی

حتمی اور آخری فیصلہ ابھی سے کر لینا چاہیئے۔

"اچھی بات ہے، سوچیں گے" ہم نے مرزا کو ٹالنے کے لئے کہا۔

"جی نہیں، یوں پیچھا نہیں چھوٹے گا، آپ کل تک فیصلہ کر کے مجھے بتا دیں۔ ورنہ میرا کام ادھورا رہ جائے گا" مرزا بولے۔

"کیا مطلب، آپ کا کام کیسے ادھورا رہ جائے گا" ہم نے پوچھا۔

"دراصل میں یہ جائزہ لے رہا ہوں کہ انتخابات میں کونسی جماعت جیتے گی"

"آپ کو کتنے نفلوں کا ثواب ہو گا" ہم نے کچھ چڑ کر کہا۔

"ثواب ہو یا نہ ہو، کم سے کم اتنا تو ہو گا کہ ملک و قوم کے مستقبل کے بارے میں ایک اندازہ ہو جائے گا۔ میاں ذرا احساس تو کرو کہ ملک کتنے نازک دور سے گذر رہا ہے۔ ہر شہری کے لئے لازم ہو گیا ہے کہ وہ حالات کا جائزہ لے، سیاسی جماعتوں کے کردار اور طرز فکر و عمل پر غور کرے اور فیصلہ کرے کہ اسے کس کے حق میں اپنا ووٹ استعمال کرنا ہے، اگر تمہاری طرح سارے کے سارے پڑھے لکھے لوگ لاپرواہ ہو کر بیٹھ رہے تو ایسی تباہی آئے گی کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔"

مرزا کی طویل اور بصیرت افروز تقریر سن کر اچانک ہمیں احساس ہوا، کہ واقعی ہم اہم قومی معاملات سے مجرمانہ غفلت کے مجرم ہیں۔ ہمیں حالات کا جائزہ پہلی فرصت میں لینا چاہیئے تھا، اور اخبارات کو غور سے پڑھ کر سیاسی اعتبار سے کوئی اہم فیصلہ کرنا چاہیئے تھا.... وغیرہ وغیرہ۔

اب سوال یہ تھا کہ ہم مرزا کے اس قدر مختصر نوٹس کی تکمیل کیونکر کریں، ہم نے اعتراف گناہ کرتے ہوئے کہا۔

"مرزا صاحب! آپ کے ارشادات بجا، لیکن ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ ہم اپنی سیاسی رائے کے قیام کے لئے کونسا راستہ اختیار کریں۔ اب ہمیں احساس دلایا ہے تو ذرا سی رہنمائی بھی کیجیے، کل تک کوئی فیصلہ کر کے آپ کو بتانا ہمارے لئے قطعاً ناممکن ہے۔"

"افوہ! تو میاں جلدی کیا ہے" مرزا نے ازراہ شفقت ہمیں دلاسا دیا۔ "میں تمہیں اخبارات کی فائل بھجوا دیتا ہوں انہیں غور سے پڑھو، دو تین روز میں خود ہی کسی فیصلے پر پہنچ جاؤ گے۔"

ہم نے موقع غنیمت جانا، خوب جوش و خروش سے وعدہ کر لیا کہ ہم ان کے بھیجے ہوئے اخبارات کا مطالعہ لوح سے پرنٹ لائن اور فلمی و غیر فلمی اشتہارات تک پورے خشوع و خضوع سے کریں گے اور جونہی کسی رائے پر پہنچے بہ نفس نفیس مرزا کے در دولت پر حاضر ہو کر اس کی اطلاع کر دیں گے۔"

مرزا ہمارے نوزائیدہ قومی شعور پر با آواز بلند عش عش کرتے ہوئے رخصت ہو گئے اور پھر اسی شام مختلف اخبارات کے موٹے موٹے فائل مع گرد کے ہمارے پاس پہنچا دیئے۔ ہم خوش تو بہت ہوئے کہ مسئلہ آسانی سے حل ہو جائے گا لیکن بار بار اس خیال سے ہول آتی تھی کہ سیاسی خبریں اور بیان بازیاں ہمیں اختلاج میں مبتلا کر دیتے

ہیں۔ تاہم دل پر جبر کیا، اعصاب کو شکست و ریخت سے بچانے کے لئے حکیم صاحب سے خصوصی معجون حاصل کیا اور رات ہوتے ہی بستر پر فائل بچھا کر اور خود کرسی پر ہو بیٹھے تاکہ مطالعہ میں آسانی رہے اور نیند کے غلبہ سے بھی نجات حاصل رہے۔

پہلے فائل کا پہلا ہی اخبار کھولا تھا کہ ایک انتہائی ہولناک منظر پر نظر رک کر رہ گئی۔ عرف عام میں یہ ایک قوم کے دردمند رہنما تھے جو فی الواقعی جوش و جذبہ سے قوم کو اپنے ارشادات عالیہ سے نواز رہے تھے، لیکن صورت کچھ ایسی بن گئی تھی کہ تصویر بچوں کو ڈرانے کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتی تھی۔

بہر حال ہمیں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ ان کے ارشادات پر نظر دوڑا لیتے، پھر درویش بر جان درویش سیاسی جائزہ تو لینا ہی تھا، حواس مجتمع کئے، دل کو مضبوط کیا، دو تین گہرے سانس لے کر لرزتے ہاتھوں سے دوبارہ فائل کھولا۔

ہم نہیں بتا سکتے کہ سیاسی خبریں پڑھ پڑھ کر ہماری کیا حالت ہو گئی، ہم یقیناً بڑے سخت جان ہیں کہ متواتر دو دن تک سیاسی خبریں پڑھتے رہے اور جانبر رہے۔ بہر حال ان خبروں سے ہم نے بخوبی اندازہ لگا لیا کہ آج کل سیاست کے میدان میں کیا ہو رہا ہے۔ دو مہینے کی روئیداد اس تمام عرصہ کی سیاسی کارروائی کو سمجھ لینے کے لئے کافی تھی۔ جب سے ملک میں سیاسی آزادیاں بحال ہوئی تھیں۔۔۔۔

اب ہم مرزا صاحب کے منتظر تھے، تیسرے دن حضرت وارد ہوئے ہم نے انہیں دیکھ کر اپنے غصہ کو لگام دی اور زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ انہی سیاسی جماعتوں کی بات کر رہے تھے۔"

"ہاں۔ کیوں؟" وہ کچھ حیران نظر آ رہے تھے۔

"کیا یہی وہ لوگ ہیں جو اس قوم کی باگ ڈور سنبھالنے جا رہے ہیں۔" ہم نے دوسرا مکالمہ ادا کیا۔

"ہاں... ہاں... مگر..."

"کیا آپ انہی جماعتوں میں سے کسی کو ووٹ کے لئے منتخب کرنے پہ مُصر تھے۔"

"بھئی۔ آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟" وہ تنگ آ کر بولے۔

"ہمیں افسوس ہے مرزا صاحب، ہم ان جماعتوں میں سے کسی کو بھی اپنے ووٹ کا مستحق تسلیم نہیں کرتے۔ ہماری دانست میں ان میں سے ایک بھی جماعت قوم و ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کی اہل نہیں ہے۔"

"لیکن بھئی، آخر کیوں؟"

"آپ ہی بتایئے کہ ان تمام جماعتوں میں ایک آدمی بھی ایسا نظر آتا ہے جس نے اپنے اندر اہلیت اور خلوص دونوں کی موجودگی کا ثبوت دیا ہو، یہ تو ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے میں اپنی صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ اس کا

نتیجہ کیا ہوگا، ذاتیات میں الجھنے کے بجائے انہیں تعمیری طرزِ فکر اختیار کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن یہ تو ایک دوسرے پر اوچھے وار کر رہے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے سنجیدہ طبقہ ان سے بیزار نظر آتا ہے۔ عام لوگ ان کے بیانات سے اس طرح محظوظ ہوتے ہیں جیسے تماشائی اسٹیج پر ہونے والے کھیل سے ہوتے ہیں۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجئے سنجیدہ سیاسی مہموں کے دوران اس قسم کے لایعنی اور فضول بیانات دینے سے کیا فائدہ۔ آپ ہمیں سمجھانے آئے تھے لیکن ہمارا خیال ہے کہ آپ کو سیاسی رہنماؤں کو سمجھانا چاہیئے کہ ملک انتہائی نازک صورتِ حال سے دوچار ہے اور حالات ان سے سنجیدگی، متانت، بردباری اور معاملہ فہمی کا مطالبہ کر رہے ہیں جمناسٹک کا نہیں۔"

"جمناسٹک؟" مرزا چونکے۔ "یعنی میرا مطلب ہے اس سے آپ کا مطلب کیا ہے؟"

"مطلب تو بہت کچھ ہے" ہم نے کہا: "مثال کے طور پر وہ لیجئے بلیوں والی بات۔ کوئی کہتا ہے کہ میرے پاس دس بلیاں ہیں۔ کسی کو دعویٰ ہے کہ ان کی جھولی میں ایک بلا ہے جو دس بلیوں پر بھاری ہے۔ بھلا بتایئے اس قسم کے بیانات بیرونی ممالک پر کیا اثر ڈالتے ہوں گے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے یہ حضرات سیاست کی آڑ میں ذاتی عناد اور پرخاش نکال رہے ہوں۔ ہمیں تو کوئی بھی قوم و ملک کے مسائل سے باخبر نظر نہیں آتا۔"

"خیر اس بحث کو چھوڑو، یہ بتاؤ کس جماعت کے نظریات سے متاثر ہوئے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"اس موضوع کو نہ ہی چھیڑیئے تو بہتر ہے" ہم نے بات ختم کرنی چاہی۔

"ارے بھائی، آخر آپ کسی نتیجہ پر تو پہنچے ہی ہوں گے نا؟" مرزا اتنی جلدی چھوڑنے والے نہ تھے، اس لئے طوعاً و کرہاً ہم نے ذہن پر زور دے کر اپنے تاثرات کا بیان شروع کر دیا۔

"مرزا صاحب ہماری دانست میں اس وقت اصل مسئلہ یہ ہے کہ انتخابات پرامن اور صحت مند فضا میں ہوں۔ عوام کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر آزادانہ طور پر اپنی رائے استعمال کریں اور معقول لوگوں کو منتخب کر کے قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں بھیجیں۔ سیاستدانوں کی سمجھ میں بھی یہ بات بڑی آسانی سے آجانی چاہیے اور انہیں ساری توجہ اس امر پر مرکوز رکھنی چاہیے کہ وہ عوام کو عام انتخابات کی اہمیت سے آگاہ کریں اور اپنے پروگرام کو مقبول بنا کر مثبت طریقوں سے عوام کی حمایت حاصل کریں لیکن یہاں صورت حال یہ ہے کہ عوام سیدھی راہ چلنا چاہتے ہیں اور لیڈر دائیں اور بائیں کی تفریق میں الجھے ہوئے ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ دائیں کی قسمیں بھی بے شمار ہیں اور بائیں میں بھی ایک عجیب سا انتشار برپا ہے۔ سوشلزم اور کمیونزم ہیں تو قسم قسم کے اور اسلام ہے تو وہ بھی ہزار طرز کا، ایسے حالات میں ایک عام آدمی کیا فیصلہ کر سکتا ہے؟"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کسی بھی جماعت کے حق میں نہیں ہو" مرزا نے ہمیں گھور کر دیکھا۔

"جماعت کی تو بات ہی چھوڑ دیجیے آج کل کون جماعت کو دیکھتا ہے، ایک زمانہ تھا جب جماعت سے افراد کو پہچانا جاتا تھا اب تو افراد اور قائدین سے جماعتیں جانی جاتی ہیں۔"

"چلو یہی سہی۔ جماعت نہیں افراد ہی سہی۔ لیکن قصہ یہ ہے کہ اخبارات والے نمک مرچ لگا کر خبروں کا بنیادی اثر بدل دیتے ہیں۔ میرے خیال میں بہتر طریقہ یہ رہے گا کہ تم دو تین جلسوں میں شرکت کرو۔ اس طرح تم صحیح طور پر پرکھ سکو گے کہ کون سا لیڈر صحیح معنوں میں تمہارے ووٹ کا حقدار ہے۔ ظاہر ہے کہ ان ہی میں سے کسی کو چننا ہے، چاند سے لوگ آنے سے رہے۔" مرزا نے پینترا بدل کر گویا دوسرا کاری وار کیا۔

"آپ کہتے ہیں تو یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔"

دوسرے دن ہم ایک جلسہ گاہ میں موجود تھے یہ ایک ایسی پارٹی کا جلسہ تھا جو بقول شخصے "اسلام پسند" تھی۔ یہ اسلام پسند والی بات آج تک ہماری سمجھ میں نہ آسکی۔ ہم نے اس بارے میں مرزا صاحب سے استفسار کیا۔

"مرزا صاحب، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام پسند سے کیا مراد ہے۔ ہماری نظر میں تو اسلام پسند وہ غیر مسلم ہیں جو اسلام کے بعض اصولوں اور اخلاقی

ضوابط کو پسند کرتے ہیں۔ یہ مسلمانوں میں اسلام پسند کیسے پیدا ہو گئے"۔

"بھئی بات دراصل یہ ہے کہ کچھ جماعتیں خالص اسلامی نظام لانا چاہتی ہیں جن کو عوامی زبان میں مولویوں کی جماعتیں کہا جاتا ہے۔ کچھ جماعتیں صرف موٹے موٹے اسلامی اصولوں کو نافذ کرنے کے حق میں ہیں۔ یہ جماعتیں خالص اسلامی جماعتیں نہیں ہیں بلکہ اسلام پسند جماعتیں ہیں۔"

"مگر"۔۔۔ ہم کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ اچانک مائکروفون پر اعلان ہوا کہ پارٹی کے عظیم رہنما اسٹیشن کے قریب رک گئے ہیں کیونکہ مخالفین کے ایک گروہ نے ان کے جلوس میں گڑبڑ پیدا کر دی ہے اور دونوں جماعتوں کے درمیان تصادم ہو گیا ہے۔ یہ اعلان سنتے ہی پنڈال میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے مخالف جماعت اور اس کے لیڈروں کے خلاف نعرے لگانے شروع کر دیئے، مرزا صاحب اس میں پیش پیش تھے۔ وہ اس سے بے خبر تھے کہ ان کے پیچھے کی قطار میں مخالف جماعت کے حامی بھی موجود ہیں۔ پہلے ان سے تکرار ہوئی لیکن ہاتھا پائی کی نوبت آنے سے پہلے ہم ایک طرف کو کھسک لئے۔ ہم نے مرزا صاحب کو دیکھا وہ ہاتھ ہلا ہلا کر مخالفین کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ پھر یکایک فضا میں ایک کرسی بلند ہوئی اور ہنگامہ دار و گیر شروع ہو گیا۔ اتنے میں کچھ لوگوں نے ڈنڈے بھی اٹھا لئے، ہم نے تیزی سے جلسہ گاہ سے باہر کی راہ اختیار کی۔ مرزا صاحب شاید درمیان میں پھنس گئے تھے۔ بہر حال ہم ان کا حشر دیکھنے کے لئے وہاں نہیں رک سکتے تھے دروازے

سے نکلے تو شور سنائی دے رہا تھا۔

"مارو، مارو، اسٹیشن والے فتنے یہاں بھی آ گئے، جانے نہ پائیں۔" ہم نے باہر آ کر جو دوڑ لگائی ہے تو سیدھے گھر پر آ کر دم لیا۔

دوسرے دن اطلاع ملی کہ مرزا صاحب اسپتال میں ہیں۔ پسلیوں اور کمر میں شدید چوٹیں آئی ہیں۔ ہم عیادت کو گئے تو وہ مسکرا رہے تھے۔

"کہیئے مرزا صاحب . . . کیا حال ہیں؟" ہم صرف اخلاقاً مسکرائے۔

"بھئی معاف کرنا۔ میری وجہ سے تمہیں خاصی تکلیف اٹھانی پڑی۔" انہوں نے نحیف آواز میں کہا۔ پھر کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں مگر پارٹی منتخب کرنے کا موضوع نہیں اٹھایا گیا۔ شاید مرزا صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

واپسی پر ہم خوش تھے کہ چلو سیاست سے نوجوان چھوٹی مگر سانتھ سوچ رہے تھے کہ آخر یہ سیاست کی کونسی قسم ہے جو ہمارے ملک میں رائج ہے، ایک عام آدمی کیونکر فیصلہ کر سکے گا کہ مجھے فلاں پارٹی یا شخصیت کو ووٹ دینا ہے۔ فی الحال تو یہ سوال محض سوال ہے، شاید انتخابات تک کوئی جواب بھی پیدا ہو سکے۔

(سنہ ۱۹۷۰ء)

"یار زندہ ....."

مہر صاحب ہمارے بڑے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ ایک عرصہ سے ملنا جلنا تھا۔ ہمیں وہ اور خصوصاً ان کی باتیں بہت پسند تھیں۔ نہایت پُرمذاق آدمی تھے، گفتگو اتنی دلچسپ ہوتی تھی کہ آدمی اکتانے نہیں پاتا تھا۔ صاحب ذوق اور بلند مذاق آدمی تھے، شاعری بھی فرماتے تھے اور پان بھی نہایت باقاعدگی سے کھاتے تھے۔ وہ ہمارے یہاں کی چائے کے بڑے مداح تھے، ان کا کہنا تھا، "بھئی بخمی صاحب، چائے یا تو ہمارے یہاں کی ہوتی ہے یا پھر آپ کے گھر کی۔ اور تو کہیں کی بھی پسند نہیں آتی۔ ویسے بھی اپنے اپنے ذوق کی بات ہوتی ہے۔ بعض لوگ ہر قسم کی چائے بلا تکلف پی جاتے ہیں۔ سچی بات ہے ہم سے تو ایسی چائے پی نہیں جاتی۔"

ہم نے ان کے یہاں کی چائے کبھی نہیں چکھی تھی، جانا ہی نہیں ہوا تھا کبھی، اور جانا تو اس وقت ہوتا جب وہ ہمارے یہاں آنے کا کبھی ناغہ کرتے۔ ہر ہفتہ نہایت پابندی سے حاضری دیتے تھے، شام کی چائے اور رات کا کھانا عموماً ہمارے ساتھ ہی ہوتا تھا۔

کچھ لوگ میر صاحب کے بارے میں بہت بری رائے رکھتے تھے، یہ بات کافی شہرت پا گئی تھی کہ میر صاحب بے حد کنجوس آدمی ہیں۔ کبھی دوستوں پر دمڑی خرچ نہیں کرتے۔ حلیہ ہے کہ ان کے گھر جاؤ تو اوّل تو باہر کھڑے کھڑے ہی ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں اگر زبردستی اندر آ بھی جاؤ تو چائے پانی تو بڑی بات ہے پان سگریٹ تک کو نہیں پوچھتے۔

ہمیں ان باتوں پر اس لئے اعتبار نہیں آتا تھا کیونکہ ہم نے میر صاحب کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ شکل وصورت اور باتوں سے وہ اس قسم کے آدمی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ یہ بات اور تھی کہ انہوں نے ہمارے اوپر ایک دھیلہ بھی خرچ نہیں کیا تھا۔ نہ کبھی سگریٹ پیش کی تھی اور نہ پان کی گلوری۔ سگریٹ کی تو جب بھی طلب ہوتی تو نہایت اطمینان سے میز پر سے ہمارا صندل کا سگریٹ کیس اٹھاتے، ایک سگریٹ منتخب کرتے اور سلگانے کے لئے ہمارا ہی لائٹر استعمال کرتے، پھر کہتے: "بخمی صاحب، آپ کے سگریٹ نہایت اعلیٰ ہوتے ہیں۔ اور افسوس یہ ہے کہ بس ہفتہ میں ایک بار ہی پینا نصیب ہوتے ہیں۔"

ہم ہنس کر جواب دیتے، "لیکن میر صاحب یہ برانڈ کوئی عنقا تو نہیں بازار میں بہت ملتی ہے۔" وہ لاپروائی سے کہتے۔

"جی ہاں، مگر نہ جانے کیوں باہر وہ بات نہیں جو ان میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ آپ کے سگریٹ کیس کی خاصیت ہو۔"

اس کے بعد اپنے پانوں کی ڈبیہ نکال کر ایک پان کا بیڑہ منہ میں دباتے ہوئے فرماتے۔

"بخمی صاحب میں جانتا ہوں کہ آپ بھی پان سے شوق فرماتے ہیں، اب چاہے آپ مجھے بد اخلاق ہی کیوں نہ ٹھہرائیں، میں آپ کو پان نہیں پیش کروں گا، کیونکہ ان میں نہایت تیز قوام اور خوشبودار تمباکو پڑا ہوا ہے۔ جو یقیناً آپ کے لئے ضرر رساں ہوگا۔ میں تو اس کے ہاتھوں تباہ ہو ہی چکا ہوں، مگر یہ کبھی نہ چاہوں گا کہ میرا ایک دوست بھی اس کا عادی ہو جائے۔"

ان تمام باتوں کے باوجود میر صاحب کو ہم ایسا نہیں سمجھتے تھے، مگر جب یہ باتیں پھیلنے لگیں تو ہم نے سوچا کہ کیوں نہ ایک دن اُن کے گھر جا کر حقیقت حال معلوم کی جائے۔

ایک روز ان کے مقررہ دن اور مقررہ وقت سے ذرا پہلے ہم ان کے گھر جا پہنچے۔ ہمیں دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گئے۔ پھر چہرے پر مسکراہٹ لانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولے۔

"ارے بخشی صاحب آپ، آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔ بندہ تو خود حاضری دینے کے لیے پر تول رہا تھا۔ آئیے آپ ہی کی طرف چلتے ہیں وہیں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔"

"ارے نہیں میر صاحب، یہ بھی تو ہمارا ہی گھر ہے، وہاں بیٹھے، یہاں بیٹھے، کون سا فرق پڑتا ہے۔ آئیے۔ اندر چلیں۔" ہم نے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔

"یقیناً۔۔ یقیناً۔۔ اس میں بھلا کیا شک ہے، لیکن اندر کی فضا نہایت مکدر ہو رہی ہے، میں نے ابھی مچھروں کی دوا چھڑکی ہے۔ اور تمام دروازے بند کر دیے ہیں۔ آپ کی بھابی بھی صحن میں بیٹھی ہیں۔"

"کوئی بات نہیں، برآمدے میں بیٹھ جاتے ہیں۔" ہم نے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں صاحب، بھلا یہ بھی کوئی شریف آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے آپ بھی کمال کرتے ہیں، میں تو ڈرائنگ روم کھول دیتا، مگر اندر کی فضا۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔ یہیں بیٹھے جاتے ہیں۔" ہم نے برآمدے میں بچھی ہوئی ایک کرسی سنبھال لی، وہ بھی بے جان جسم کے ساتھ ایک کرسی پر ڈھیر ہو گئے۔ کچھ گھبرائے ہوئے سے تھے۔

"کیوں طبیعت تو ٹھیک ہے، میر صاحب۔" ہم مسکرائے۔

"جی۔۔ جی ہاں۔۔۔۔ جی نہیں۔۔۔ طبیعت تو صبح ہی سے ناساز ہے۔

سوچا تھا کہ آپ کے گھر چل کر طبیعت کچھ بہل جائے گی لیکن آپ خود ہی آ گئے۔
بڑی ندامت ہے کہ ایسی حالت میں آئے جب کہ کسی قسم کی تیاری نہیں ہے۔"
وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولے۔

"تیاری، کس بات کی تیاری، ہم کون سی دعوت کھانے آئے ہیں آپ کے یہاں۔"

"پھر بھی، صبح سے نکلنا ہی نہیں ہوا، سر بھاری ہو رہا تھا، نہ بازار گیا، نہ سودا سلف ہی آ سکا۔ تھوڑا سا رات کا کھانا بچا ہوا تھا اسی پر اکتفا کرنا پڑا۔ بیگم کی طبیعت بھی یونہی سی رہتی ہے، اب کون کھانا تیار کرے اور کون چائے بنائے، بڑی الجھن ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، سوچتا ہوں ملازم رکھ لوں مگر بیگم کسی غیر کا وجود برداشت کرنے کو تیار نہیں، ہو تو کیا ہو۔"

"ارے بھئی میر صاحب ہم تو آپ سے ملنے آئے ہیں یہ آپ کھانے پینے کا کیا قصہ لے بیٹھے۔"

"بھئی سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی کس طرح تواضع کی جائے۔" وہ شش و پنج میں مبتلا تھے۔

"اماں میر صاحب آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں، ہم تو محض ملنے آئے ہیں، اور پھر اس تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں، آپ جیسے دوستوں سے خواہ مخواہ تکلف برت

رہا ہوں۔ اور سنائیے، آپ کی نئی کار کیسی چل رہی ہے؟"

"بہت اچھی"، ہم نے جواب دیا۔ "آپ کب خرید رہے ہیں؟"

"ابھی سوچ ہی رہا ہوں، کوئی فیصلہ نہیں کر پایا" انہوں نے کہا۔

"اتنے بڑے شہر میں کار ایک آسائش نہیں ضرورت ہو گئی ہے۔ اس کا ہونا ناگزیر ہے۔"

"درست فرماتے ہیں" انہوں نے کہا وہ کچھ سوچ رہے تھے، کچھ دیر بعد بولے

"کچھ سنا بھی صاحب، یار لوگ آج کل کس کس انداز میں بندے کو ہدفِ ملامت بنا رہے ہیں جس کے جو منہ میں آ رہا ہے بکے جا رہا ہے، اب بتلائیے میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے، جو وہ یوں لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔"

"یہی ہم سوچ رہے ہیں، آخر ایسی باتیں کیوں گشت کر رہی ہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"ارے چھوڑیئے صاحب، جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، ایک دن حقیقت سب کے سامنے آ جائے گی، جھوٹے کا منہ کالا ہو کر رہے گا۔" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولے۔

"ہمیں ان باتوں پر بالکل یقین نہیں آیا۔"

"بخدا آپ ہی ہمارے سچے دوست ہیں، اور یقین مانیئے کہ آپ سے بڑھ کر مجھے کوئی عزیز نہیں ہے۔ آج کل سچے دوست کہاں ملتے ہیں۔"

ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ بولے۔

"آیئے ذرا باہر ٹہلا جائے۔ یہاں کس قدر گھٹن ہے" وہ اُٹھ گئے تھے۔

"ارے نہیں، بیٹھیے بھی، یہاں تو بڑا اچھا لگ رہا ہے"

وہ طوعاً کرہاً دوبارہ بیٹھ گئے، ورنہ ان کا جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ ہم جلد از جلد دفان ہو جائیں مگر ہم اتنی آسانی سے ان کا پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے، بولے "میر صاحب ایک گلاس پانی مل جائے گا"

"پانی، ارے صاحب چائے کا انتظام کرنے والا تھا مگر کمبخت اسٹو و صبح سے خراب پڑا ہے، خیر پانی ہی لاتا ہوں، یہیں بیٹھے رہیے گا" انہوں نے ہاتھوں سے کچھ اس قسم کا اشارہ کیا جیسے اگر وہ یہ نہ کرتے تو ہم ان کے ساتھ اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے، انہوں نے دروازے کے پٹ ذرا سے کھولے اور اندر غائب ہو گئے۔ کچھ دیر بعد منہ لٹکائے ہوئے واپس آئے۔

"شاید پانی میں بھی مچھر والی دوا کا اثر ہو گیا ہے، عجیب بد مزہ ہو گیا ہے، منہ تک لے جاتے ہی اُبکائی آتی ہے، میرا خیال ہے کہ سامنے والے ہوٹل سے پی لیتے ہیں۔ بھئی بڑے سوندھے گھڑے رکھ چھوڑے ہیں، ایمان سے مزہ آجائے گا"

"اچھا، اچھا، لیکن اس وقت اس جگہ بیٹھنا اتنا خوشگوار معلوم ہو رہا ہے کہ اُٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ بھئی میر صاحب بہت خوب مکان بنایا ہے آپ نے

ہوا کا رخ اسی جانب ہے۔ جی چاہتا ہے یہیں بیٹھے رہیں۔"

"اجی، آپ تو خواہ مخواہ شرمندہ کر رہے ہیں ورنہ کیا میں نہیں جانتا کہ یہ مکان اس قابل نہیں ہے کہ کوئی شریف آدمی یہاں قدم رکھے۔" وہ شرمندہ سی ہنسی کے ساتھ بولے۔

"یہ تو آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں، ورنہ..."

"اچھا چھوڑیئے بھی، مجھے آپ کی گفتگو سے شدید احساس محرومی پیدا ہو رہا ہے، اگر اس موضوع کو ختم کر دیا جائے تو بہتر ہو گا۔" وہ کچھ جھنجھلا گئے تھے۔

"اگر یہ بات ہے تو ہم اپنے الفاظ واپس لئے لیتے ہیں۔" ہم نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

"ارے نہیں۔" وہ ہنس پڑے، "دیکھئے نا، آپ کی شاندار کوٹھی کے آگے یہ مکان کیا حقیقت رکھتا ہے۔ بس اسی چیز کا احساس ہو رہا تھا۔"

"اوہ۔" ہم ہنس پڑے "لائیے اسی بات پر ایک سگریٹ تو پلائیے، آج ہم اپنا پیکٹ گھر بھول آئے ہیں۔" یہ کہہ کر ہم نے ہاتھ بڑھا دیا۔

"قسم لے لیجئے، نجمی صاحب، صبح سے ایک کش کو ترس رہا ہوں، رات ہی سگریٹ ختم ہو گئے تھے، پھر نکلنا ہی نہیں ہوا۔ اگر آپ کے پاس ہوتا تو شاید ہمیں بھی مل جاتا، اب ذرا ٹھنڈے وقت نکلوں گا۔"

"ارے تو سامنے کے ہوٹل سے منگا لئے ہوتے۔" ہم نے ڈھیٹ بن کر کہا۔

"اس ہوٹل سے"۔ انہوں نے بُرا سا منہ بنایا۔ "اس ہوٹل میں تو نہایت گھٹیا سگریٹ ملتے ہیں جو اس قابل نہیں ہوتے کہ ایک بھی کش لیا جائے" تو یہ کیجیے صاحب۔"

"اچھا، سگریٹ چھوڑیے، ایک پان ہی سہی، بات یہ ہے کہ منہ کچھ خالی خالی سا لگ رہا ہے۔"

"ہاں، پان، بھئی خوب یاد دلایا۔ ابھی لیجیے، ابھی لے کر حاضر ہوا" یہ کہہ کر وہ دوبارہ اسی دروازے میں جھری کر کے غائب ہو گئے اور کچھ دیر بعد ہاتھ جھلاتے واپس آ گئے۔

"بھئی، واقعی آج تو شرمندگی سے گردن اٹھانے کے قابل نہیں ہوں۔ چونا، کتھا، چھالیہ ہر چیز موجود ہے، مگر پان ندارد، دو تین گلے سڑے تپے پڑے ہیں۔ یہ کم بخت ہوا ایسی چل رہی ہے کہ سارے پان گلے جاتے ہیں۔ یقین مانیے ایسے سیاہ پڑ گئے ہیں جیسے کولتار میں ڈبوئے گئے ہوں۔ آج بازار جانا ہی نہیں ہوا ورنہ آپ کو نہایت تازہ پان پیش کرتا۔ اب جاؤں گا تو پان وغیرہ کا بندوبست کروں گا۔ بھئی رات کے کھانے کے بعد پان ضرور کھاتا ہوں، بڑی فرحت بخشتا ہے،" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا میر صاحب، پھر اجازت دیجیے۔ آپ کا بڑا وقت لیا۔"

"اچھا بھئی، معاف کیجیے، اگر مطلع کر کے آتے تو شاید آپ کو یوں زحمت

اٹھانی نہ پڑتی۔ خیر پھر سہی، یار زندہ صحبت باقی۔

مگر پھر اس کی نوبت ہی نہ آنے پائی۔ آئندہ جو میر صاحب تشریف لائے تو ایک بار کہلوا دیا کہ ہم گھر پر نہیں ہیں، دوسری دفعہ سلام کا جواب دیتے ہوئے کار میں بیٹھ گئے اور بولے۔

"معاف کیجئے، ذرا جلدی میں ہیں۔"

دو تین بار جب ایسا ہی ہوا تو انھوں نے آنا ہی ترک کر دیا۔ لہٰذا یار تو زندہ رہا — مگر صحبت میسر نہ آسکی۔

(اکتوبر ۱۹۶۷ء)

•

دینا اک لیکچر کا.....!

حالانکہ یہ محاورہ پرانا ہو چکا ہے لیکن اس موقع کے لیے اس سے بہتر کوئی اور بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی جانب بھاگتا ہے۔ ہماری شامت نے جو دھکا دیا تو ہم نے پروفیسر حمید اللہ خاں صاحب سے جامعہ کے طلبا کو لیکچر دینے کا حماقت آمیز وعدہ کر لیا۔ یہ تجربہ شاید ہمیں زندگی بھر یاد رہے گا۔ آج بھی جب وہ گھڑی یاد آتی ہے تو جسم میں سنسناہٹ سی ہونے لگتی ہے۔ اور ہم دل ہی دل میں دعا مانگتے کہ اے مالک کونین آئندہ ہمیں اس قسم کے تجربے سے محفوظ رکھیو، لیکن یونیورسٹی سے منسلک ہوتے ہوئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ایسے "حادثے" سے دوبارہ دوچار نہ ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارا تعلق یونیورسٹی کے ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ سے ہے اور صرف جامعہ کے

انتظامی امور کی دیکھ سبھال ہمارے ذمہ ہے، لیکن اتفاقات کہاں نہیں ہوتے ——— ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم فن خطابت میں صفر ہیں اور اپنیا مافی الضمیر دلکش اور خوبصورت طور پر تو کیا معمولی پیرائے میں بھی بیان کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ مسلسل اور بامعنی گفتگو کرنے والے کی ایک فنکار جیسی قدر کرتے ہیں۔ اپنی اسی کمزوری کے سبب ہم نے معلمی قبول نہیں کی تھی، حالانکہ ہمارے پاس وہ تمام سندیں موجود ہیں جو اس پیشہ کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔

یہ محض اتفاق تھا کہ اس دن ہمیں قدرے فرصت تھی اور ہم کرسی کی پشت سے ٹیکے اونچے سُروں میں کچھ گا رہے تھے کہ اچانک پروفیسر حمید اللہ خاں کی آمد نے چونکا دیا۔

"آیئے... آیئے... حمید اللہ صاحب، آج کیسے بھول پڑے" ہم نے کھڑے ہو کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ حمید اللہ خاں جامعہ میں شعبۂ اردو کے سربراہ تھے اور کہنہ مشق اور تجربہ کار استادوں میں شمار کئے جاتے تھے مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ ایک ہی ادارہ میں ہوتے ہوئے بھی ان سے ہفتوں ملاقات نہیں ہوتی تھی۔

"معاف فرمایئے گا ——— آپ غالباً کسی حسین خیال میں تھے، میں نے آپ کو خواہ مخواہ پریشان کیا۔" انھوں نے کہا۔

"اوہ، کچھ نہیں، یونہی ذرا، آپ فرمایئے کیسے زحمت فرمائی۔"

"بھئی بات یہ ہے کہ کل مجھے ذرا کام ہے، ایک آدھ گھنٹہ کے لئے ذرا شہر جانا ہوگا۔ میری خواہش ہے کہ کل میری جگہ آپ ایک بی اے کی کلاس لے لیں" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"ہا... ہا... ہم یعنی ہم کلاس لے لیں... آپ کی؛ واللہ آپ بھی کمال..."

"جی... کمال وال کچھ نہیں... آپ کی صلاحیتیں ہم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر آپ معلم ہو جائیں تو بے حد کامیاب ثابت ہوں۔ آپ اپنی صلاحیتیں پرکھ تو دیکھئے"۔

"جی... آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم اور معلمی..." ہم نے یہ بات شاید کچھ اس انداز میں کہی کہ وہ اسے انکساری سمجھ بیٹھے۔

"اچھا، اچھا۔ اس پر پھر کبھی غور فرمائیے گا۔ فی الحال آپ کل میرے لئے زحمت کر لیجئے۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ میں اپنے دعوے میں کس حد تک حق بجانب ہوں۔ آپ کو قطعی تکلیف نہ دیتا مگر کام اتنا اہم ہے کہ مجبوراً جانا پڑ رہا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی نہیں چاہتا کہ طلبا کا ناغہ ہو"۔

"وہ تو ہمیں معلوم ہے کہ آپ نے شاید ہی کبھی کوئی ناغہ ہونے دیا ہو، اور یہ حقیقتاً بڑی قابل قدر اور باعث فخر بات ہے"۔

"اچھا تو بس... معاملہ طے ہے۔ میں آج ہی کلاس میں آپ کا تعارف

کرادوں گا اور کل آپ کسی بھی موضوع پر لیکچر دے ڈالئے گا۔ میرا خیال ہے کہ غالب کی خطوط نویسی پر اگر لیکچر ہوجائے تو خوب رہے۔ آپ کو تو مرزا غالب کی خطوط نویسی پر خوب عبور حاصل ہے۔"

"آپ کی قدر افزائی ہے۔ ورنہ بھلا ہم کس لائق ہیں۔" ہم نے انکسارانہ انداز میں کہا۔ وہ تو چلتے بنے، مگر ہمیں بڑے شش و پنج میں چھوڑ گئے

کل کے لیکچر کا تصور ہی ہمارے ہاتھ پاؤں پھلائے دے رہا تھا — کل ہمیں بولنا تھا اور وہ بھی بھری پُری کلاس میں۔ نہ صرف بولنا تھا، بلکہ سمجھانا بھی تھا۔ یہ کام تو تقریر سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ اب کیا کریں۔ اُف خدایا، یہ حمید اللہ صاحب بھی کس مصیبت میں پھنسا گئے۔ ہم بے اختیار اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ دل کی حرکت اچانک تیز ہوگئی۔

اور جب ہمیں ایک ایسے استاد کا خیال آیا جس نے حال ہی میں یونیورسٹی جوائن کی تھی تو ہمارے پسینے چھوٹنے لگے، پہلے دن کلاس روم میں لڑکوں کے ہاتھوں اس بے چارے کی جو گت بنی تھی وہ قابل عبرت تھی۔ اگر ہم اس کی جگہ ہوتے تو شاید تمام عمر کلاس روم کی شکل نہ دیکھتے مگر وہ غریب آج بھی نہایت دلجمعی اور محنت سے تعلیم دینے میں مصروف ہے۔ اسے کبھی اس بات کی پروا نہیں ہوئی کہ لڑکے اپنی تفریح کے لئے اسے تختۂ مشق بناتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ اگر ہم میں صبر و استقلال کا اتنا مادہ ہوتا تو شاید ہم اس پیشہ میں کھپ جاتے، مگر،

موجودہ صورت حال میں تو یہ انتہائی دشوار بلکہ ناممکن تھا۔

ہمارے اندر سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہم مجمع کو دیکھ کر بدحواس ہو جاتے ہیں اور گفتگو کے دوران باقاعدہ ہکلانے لگتے ہیں، تین چار آدمیوں کے درمیان تو خیر کام چل جاتا ہے مگر بیس پچیس یا زائد کا مجمع دیکھ کر بری طرح نروس ہو جاتے ہیں، یوں لگتا ہے جیسے منہ سے غلط بات نکلی نہیں کہ ہاتھوں ہاتھ لئے جائیں گے۔ ہر آدمی کی نگاہ میں یوں لگتی جیسے منہ سے نکلنے والی بات لپکنے کو تیار ہو۔

اسی ٹہلنے کے دوران ہم نے فیصلہ کیا کہ جب سر اوکھلی میں دے ہی دیا تو کیوں نہ ایک بار یہ تجربہ بھی سہی۔ لیکن کلاس روم میں قدم رکھنے سے پہلے ہم پوری طرح تیار ہو جائیں تاکہ ہر حملہ آور کا جم کر مقابلہ کر سکیں۔ لہذا ہم نے سوچا کہ آج رات کو غالب کی خطوط نویسی کا بھرپور مطالعہ کریں گے تاکہ کل بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بلا رکاوٹ بولتے چلے جائیں۔ مگر فوراً ہی اپنی کمزوری کا خیال آیا۔ کلاس روم میں بیٹھے ہوئے طلبا کی تیز اور شرارت آمیز نگاہوں کا مقابلہ کس طرح کریں گے۔ ایسی صورت میں تو موضوع پر بھرپور عبور بھی کام نہ دے سکے گا۔ کافی سوچ بچار کے بعد طے کیا کہ کل ہم کلاس روم میں گہرے رنگ کا چشمہ استعمال کریں گے تاکہ حاضرین کو دیکھ ہی نہ سکیں، یوں ہم سکون سے لیکچر دے سکیں گے، اور لڑکوں کی نگاہیں اور چہرے کے تاثرات ہمیں ڈسٹرب نہیں کر پائیں گے۔ اس جانب سے مطمئن ہو کر

ہم کام میں مصروف ہو گئے۔

کام کے دوران کبھی کبھی آنے والی کل کا خیال ہمیں بے چین کر دیتا، اور ہماری توجہ ہٹ جاتی۔

جب ہر جانب سے مطمئن ہو گئے، تو یہ بے چینی کیسی ہے، ہم نے سوچا، یہ تو سراسر اعصابی معاملہ ہوتا ہے۔ اس کا بھی کچھ نہ کچھ سدباب ضروری ہے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ کل کے لیکچر میں یہ کمزوری آڑے آ جائے۔

چنانچہ دفتر سے فارغ ہو کر ہم اپنے ذاتی معالج کے پاس گئے، اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا، اس نے بتایا کہ کیونکہ ہمارے اعصاب کمزور ہیں لہذا ذرا سی الجھن اعصاب پر اثر انداز ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے ہم بے چینی سی محسوس کرتے ہیں۔ اس نے دو کیپسول دیئے اور ہدایت کر دی کہ ایک رات کو کھا لیں اور دوسرا کو لیکچر سے آدھا گھنٹہ پہلے، اس سے اعصاب کو فوری تقویت حاصل ہو گی اور وہ چھوٹے موٹے جھٹکوں کو برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ رات کو کیپسول کھا کر ہم نے طالب علمی کے زمانے کے نوٹس اور چند کتابیں مرزا غالب کی نثر نگاری سے متعلق نکالیں اور ان میں مرزا کی خطوط نویسی پر مواد تلاش کرنے لگے، رات گئے تک مطالعہ جاری رہا اور اس عرصہ ہم کل کے امتحان کو تقریباً فراموش کئے رہے۔ اگر خیال آیا بھی ہو گا تو اس کیپسول کی بدولت اعصاب جھنجھوڑنے میں ناکام رہا ہو گا۔

دوسری صبح ہم نے نوٹس پر ایک نظر ڈالی اور دل ہی دل میں لیکچر تیار کرنے لگے۔ ہم قطعی مطمئن تھے کہ ہال میں اچھا خاصا بول لیں گے اور پھر نہ جانے یہ خیال کیونکر ذہن میں اُبھرا کہ ہم اگر لکچرار ہوتے تو کونسا پہاڑ ٹوٹ پڑتا۔ اب تک خواہ مخواہ معلمی کو ہوّا سمجھتے رہے ہیں۔

تیار ہو کر یونیورسٹی روانہ ہوئے، اپنے اوپر اعتماد کچھ اتنا ہو گیا تھا، کہ نوٹس ساتھ لینے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن جیسے جیسے یونیورسٹی قریب آتی گئی آہستہ آہستہ ذہن پر ہیبت سی چھانے لگی۔ ہم نے خود پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش کی، ذہن کو دوسری جانب لگانا چاہا مگر توبہ کیجیے۔ یونیورسٹی کا لکچر ہال تختہ دار کی طرح نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ ہم سوچنے لگے کہ یہ اچانک تبدیلی کیسے واقع ہوئی ؟ صبح تک تو ہم بھلے چنگے تھے۔

"اوہ یاد آیا۔۔ اس وقت تک ہم اس کیپسول کے زیر اثر تھے۔"

کیپسول کا خیال آتے ہی طبیعت کچھ سنبھلی اور ہم مطمئن ہو گئے کہ لکچر ہال میں کیپسول کھا کر جانا ہے پھر بھلا ڈرنے کی کیا ضرورت۔

یونیورسٹی پہنچ کر اپنے کام سے لگ گئے، لکچر گیارہ بجے شروع ہونا تھا پونے گیارہ بجے حمید اللہ صاحب نے فون پر یاد دہانی کرائی اور ہم ٹھیک گیارہ بجنے میں پانچ منٹ پر اُٹھ گئے۔ اچانک ہمیں کچھ یاد آیا اور ہم بوکھلا گئے۔

"ہائیں، یہ کیا غضب ہو گیا، ڈاکٹر نے لکچر سے آدھ گھنٹہ قبل کیپسول کھانے کی

ہدایت کی تھی، لیکن اب لکچر شروع ہونے میں صرف پانچ منٹ ہیں، نہایت عجلت میں شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ منظر قابل دید تھا جب ہم بوکھلا بوکھلا کر اپنی تمام جیبیں ٹٹول رہے تھے۔ اس لفافہ کا کہیں پتہ نہ تھا جس میں ہم نے وہ کیپسول محفوظ کیا تھا۔ بے حد سٹپٹائے، پیشانی پسینہ سے تر ہو گئی۔ ادھر پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی ہمارے اعصاب جھنجھوڑے دے رہی تھی۔ ہمارے تمام مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ دل کے دھڑکنے کی دھمک سر میں محسوس ہو رہی تھی - ہم نہایت پریشانی کے عالم میں اپنے کمرے سے باہر آئے۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا ہوا تھا، کیپسول کھو جانے کا شدید ردّ عمل ـــ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ہم راہداری کے ایک ستون سے ٹک کر کھڑے ہو گئے تاکہ اپنے حواس مجتمع کر سکیں۔ رومال نکال کر چہرہ خشک کیا، بالوں پر ہاتھ پھیرا، پھر دو تین گہرے گہرے سانس لئے۔ اس کے بعد ان نوٹس کو ذہن میں دوہرانے لگے جو رات ہم نے دیکھے تھے، مگر اس وقت وہ نوٹس کسی سنیما کی ریل کی طرح نہایت تیزی سے دماغ میں گھوم رہے تھے، ذہن کسی بات کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ ہم نے گھڑی پر نظر ڈالی، اور کلاس روم کی طرف بڑھے، ایسا لگ رہا تھا جیسے ہمیں کوئی زبردستی ڈھکیل رہا ہو۔ اب ہم ٹانگوں میں ہلکا سا رعشہ بھی محسوس کر رہے تھے تمام کپڑے پسینہ سے تر ہو رہے تھے۔ کلاس روم کے دروازے پر ہمارے قدم جم کر رہ گئے۔ ہال میں بیٹھے

ہوئے طلبا ہمیں ایک جمِ غفیر کی صورت میں نظر آرہے تھے، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ لڑکے نہ ہوں بلکہ خرانٹ قسم کے نقاد ہوں اور ذرا سی غلطی پر ہماری ہماری "ٹانگ گھسیٹنے" کے منتظر ہوں۔ لرزتے قدموں سے خراماں خراماں ہال میں داخل ہوئے اور اپنی ڈلیسک کے قریب پہنچ کر ہم نے اس کا سہارا لیا۔ ایک نظر حاضرین پر ڈالی اور آنکھیں بند کر کے ذہن سے لڑنے لگے۔ اسے قابو میں کرنے کیلئے، طلبا کی نگاہیں ہم پر جمی ہوئی تھیں، کچھ حیرت سے اور کچھ شرارت آمیز انداز میں ہمیں دیکھ رہے تھے، ہم نے آنکھیں کھولیں اور دوبارہ بند کرنے کے بجائے تاریک شیشوں کا چشمہ جیب سے نکال کر پہن لیا۔

اس پر دو تین دبے دبے سے قہقہے کانوں سے ٹکرائے اور ہمیں یوں لگا کہ جیسے کسی نے سر پر سرِ بازار چپت رسید کر دی ہو، قطعی غیر ارادی طور پر چشمہ اُتار دیا سب سے پہلے ہماری نظر چند مسکراتے ہوئے چہروں پر گئی جس نے ہمیں مزید حواس باختہ کر دیا۔ ٹانگوں میں رعشہ کی کیفیت نے کچھ اور شدت اختیار کر لی، جس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہم نے رانوں کے پٹھے اکڑائے اور تن کر کھڑے ہو گئے کھڑکی کی سمت منہ پھیر کر دو تین لمبے سانس لئے اور اس عمل نے ذہن کو قدرے تراوٹ بخشی۔

"حضرت کچھ ارشاد بھی فرمائیے، کب تک اپنے اعصاب کی کھینچ تان میں مبتلا رہیں گے۔" ایک آواز ابھری اور ساتھ ہی کئی قہقہے بھی۔

فضا مکدر ہوتی دیکھ کر ہم نے جلدی سے کہا: "آج ہم آپ کو غالب کی خطوط نویسی پر لیکچر دیں گے" یہ جملہ بے ساختہ منہ سے نکلا تھا لہٰذا اس کی ترتیب بھی درست تھی مگر آواز حلق سے یوں پھنسی پھنسی نکلی جیسے کثرت بلغم کے سبب "مغلظ" ہو گئی ہو۔ ہم نے کھنکھار کر گلا صاف کیا، طلبا ہماری جانب یوں حیرت سے منہ کھولے دیکھ رہے تھے جیسے ہم دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہوں۔ ہم نے رومال نکال کر پیشانی پر پھیرا، پھر سوچا کہ اب شروع کر دینا چاہیے۔ ورنہ خواہ مخواہ گھٹیا قسم کے مذاق کا نشانہ بننا پڑے گا۔ چنانچہ مری ہوئی سی آواز میں بولے۔

"تو ہم کیا کہہ رہے تھے، ہاں، یاد آیا۔ مرزا صاحب سے تو آپ سب واقف ہی ہوں گے۔ ہیں نا۔ بہت پائے کے شاعر تھے وہ۔ کوئی ہے ان کی ٹکر کا ایک ہی بتائیے۔ اور ان کا اخلاق سبحان اللہ، کیا کہنے، آج تک کوئی سائل خالی ہاتھ نہیں لوٹا، آپ کے دروازے سے، سمجھے آپ، اور خودداری کا یہ عالم کہ کبھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کیا۔ خواہ گھر میں فاقہ ہی کیوں نہ ہو، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بہت خوددار واقع ہوئے تھے، غالب صاحب، ہمارا مطلب ہے جناب غالب۔۔ آ۔۔۔ آ۔۔۔۔ اپنے مرزا غالب، اتنے خوددار کہ کسی کے آگے۔۔۔۔ ہمارا مطلب ہے، کہ۔۔ جی ہاں"

ہم بے سوچے سمجھے بولتے چلے گئے، یہ سوچ کر کہ اگر ایک بار دھاک بیٹھ گئی تو پھر کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی، اور اسی چیز نے یہ تک سوچنے

کی مہلت نہ دی کہ موضوع کیا ہے۔ اور ہم کیا بک رہے ہیں۔ مرزا غالب کے اوصاف کہاں سے ٹپک پڑے یہاں۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی ہم نے رومال نکال لیا۔ اس وقت یہی ہمارے لئے وہ تنکا تھا جو ڈوبتے کو سہارا دیتا ہے۔

"مگر محترم ــــ مرزا غالب کی خطوط نویسی سے ان باتوں کا کیا تعلق ؟" ایک آواز آئی۔

"چلو وہ بھی برداشت کر لیا جائے، مگر حضرت کی آواز کیوں بھیک مانگ رہی ہے ؟" دوسری آواز آئی، جس کو نظر انداز کرنا پڑا۔

"اوہ... جی ہاں... ہم بہک گئے تھے، لیکن نہیں" ہم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اچانک ایک ایسا نکتہ ہاتھ آیا تھا کہ ہماری ہمت بندھ گئی ــــ "آپ اپنے اعتراض پر نظر ثانی فرمایئے، کیا آپ کو مرزا غالب کے خطوط میں ان کے اخلاق کا عکس نظر نہیں آتا۔ ضرور آتا ہوگا۔ ذرا سی توجہ کی ضرورت ہے، آپ یقیناً ہمارے اس دعوے کے قائل ہو جائیں گے۔ دیکھئے نا۔ مرزا نے تمام القاب و آداب یک قلم موقوف کر دیئے تھے، یعنی کبھی کسی سے لگی لپٹی نہیں رکھی ــــ ہمیشہ دو ٹوک بات کہہ دی۔ خوشامد کی عادت ہی نہیں تھی اور جو خوشامد نہیں کرتا وہ یقیناً خوددار بھی ہوتا ہے۔ یعنی دیکھئے نا، بات سامنے کی ہے مگر ذہن نہیں جاتا اس طرف۔ حالت یہ تھی کہ مرزا صاحب نے اپنا حال زار بھی اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے نہیں چھپایا، سب کچھ ضبط تحریر میں لے

آئیے۔ ملاحظہ فرمائی آپ نے ان کی طبیعت کی ... آ... آ... کیا کہنا چاہیے بلندی.... سادگی کہہ لیجئے"

"غالب کے مکاتیب کے محاسن پر بھی تو کچھ روشنی ڈالیے"

"سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے خطوط کے محاسن بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ ایک بار پڑھ جائیے ساری خوبیاں آپ کے سامنے آجائیں گی.... بالکل اسی طرح... جیسے .... جیسے... خیر جانے دیجئے کوئی معقول تشبیہہ سمجھ میں نہیں آرہی ہے..... بس یوں سمجھ لیجئے .... کہ ... بس یوں لگتا ہے .... گویا... گویا..... دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم آپ آمنے سامنے بیٹھے ہیں..... پھر ایک عجیب خوبی ان خطوط کی یہ ہے کہ... کہ..... ہمارا مطلب ہے ایک ایسی خوبی ان کے خطوط میں پائی جاتی ہے جو الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی..... اگر آپ ان کی نثر نگاری کے محاسن تلاش کرنے بیٹھیں گے، تو دفتر کے دفتر بھر جائیں گے، جی ہاں ... یہ ہمارا ہی نہیں بڑے بڑوں کا دعویٰ ہے..... کمال کی بات یہ ہے کہ کئی انشاپردازوں نے آپ کی نقل کرنے کی کوشش کی .... مگر صاحب ... . کہاں وہ بات مولوی مدن کی سی..... "

ہم کافی حد تک خود پر قابو پا چکے تھے۔

"کیا آپ کسی ایسے انشا پرداز کا نام بتانے کی زحمت گوارا کریں گے؟" ایک آواز آئی۔

"ضرور بتاتے ... مگر بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا پردے میں رہنا ہی بہتر ہے، ... کیونکہ ان انشا پردازوں کا بھی بہرحال اپنا ایک مقام ہے ... لہٰذا اُنکا نام لینا ان کی "تذلیل" کے مترادف ہوگا ..."

ہم نے یہ کہکر بات ٹال دی کیونکہ اس وقت نام ہمیں خود یاد نہیں تھا۔

اس سے قبل کہ کوئی مزید سوال کرتا ہم نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"... قصہ مختصر، مرزا غالب کے خطوط اردو ادب کا ایک ایسا انمول خزانہ ہے جو آج تک اپنی بہاریں لٹا رہا ہے ... جو چاہے فیضیاب ہو، ... اب ہمیں دیکھئے ... ہم جب بھی خط لکھنے بیٹھتے ہیں، مرزا غالب کا انداز اپنانے کی کوشش کرتے ہیں، اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ آپ لوگوں کو بھی چاہیئے کہ مرزا کے انداز کو اپنائیں ... مگر آج کل تو ہر جگہ انگریزی کا دور دورہ ہے ... قومی زبان کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے ... لوگوں انگریزی میں بات کرنا باعث فخر سمجھتے ہیں ... انگریزی لباس ... انگریزی طرز معاشرت ... یہ سب کیا ہے ... اپنی زبان ... اپنے کلچر کے ساتھ یہ سلوک کیوں ... آپ لوگ ہی کل کو اس قوم کے ناخدا بننے والے ہیں ... آپ اس کے خلاف آواز اٹھائیں ......

عوام کو اپنی زبان ۔ ۔ ۔ ۔"

"کیا آپ کا تعلق کسی سیاسی جماعت سے ہے" نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ ایک برخوردار کھڑے ہو کر بولے ۔ اور پورا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا ۔

"ہم کسی سیاسی جماعت کے رکن نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ آج اگر مرزا غالب زندہ ہوتے تو وہ بھی یہی کہتے جو ہم کہہ رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ لہذا آپ یہ سمجھیے کہ ہم مرزا غالب کی ترجمانی کر رہے ہیں ۔"

"اپنی ترجمانی بند کرو ۔"

"اس جانگلو کو باہر نکالو ۔"

"ہمیں انگریزی کے مخالف سے کوئی ہمدردی نہیں ۔"

"یہ غالب کا نہیں کسی مدرسے کے مولوی کا ترجمان ہے ۔"

یعنی آپ سمجھ گئے ہوں گے ، وہ صورت حال جو بہت پہلے پیدا ہو جانی چاہیے تھی ، بالآخر شروع ہو ہی گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر ہم اپنی جگہ مطمئن تھے ، ہمیں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے تھے ۔ سیاسی دورہ تو ہمیں بگڑتی ہوئی فضا کو دیکھ کر پڑا تھا ۔ یعنی اب ہدف ملامت ہم نہیں بلکہ ہمارے "خیالات" تھے اور یہی ہم چاہتے تھے ۔ کیونکہ بہر حال ہمیں یونیورسٹی ہی میں رہنا تھا ۔ اگر ہم خود ان کے مذاق کا نشانہ بن گئے ہوتے تو شاید پھر لڑکے تمام عمر ہمیں نہ بخشتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ

سیاسی نکتہ اچانک ہمیں سوجھا تھا جس نے ہماری عزّت رکھ لی ورنہ...
کچھ بھی ہو، اس لکچر کے دوران ہماری جو حالت ہوئی اس کے پیشِ نظر
تو یہی کہنا پڑتا ہے۔

"ایسے لکچر سے ہم باز آئے"

(۱۹۶۸ء)

•

ٹائیں ٹائیں فش

"بھاگو ——— !"

" دوڑو ——— !"

"لپکو ——— !"

ایک صاحب: کیا ہوا ——— ؟ کیا واقعہ پیش آیا؟

دوسرے صاحب: حادثہ ——— ایکسیڈنٹ۔

تیسرے صاحب: کوئی مرا تو نہیں۔

دوسرے صاحب: شاید کوئی آدمی بس کے نیچے آگیا ہے۔ اب معلوم نہیں زندہ ہے یا اللہ کو پیارا ہوا۔

تیسرے صاحب: آیئے چل کر کیوں نہ دیکھ لیں۔

دوسرے صاحب: چلیئے خدا کرے زندہ ہو۔ مگر کہاں صاحب، بس کے نیچے آکر کوئی بچا ہے۔

پہلے صاحب: اس کی تو ہڈی پسلی برابر ہو گئی ہو گی۔

تیسرے صاحب: کیوں کلمۂ بد منہ سے نکال رہے ہیں لیکن اس سے ہوتا بھی کیا ہے جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ خدا کی مرضی ہیں کس کو دخل ہے۔

پہلے صاحب: بجا ارشاد فرمایا جناب نے، یہ بس والے بڑا اندھا دھند بس چلاتے ہیں۔ آگا پیچھا دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے لیکن حضرت وہ بھی کس کس کو بچاتے پھریں۔ میں تو کہوں گا سب غلطی راہ گیروں کی ہوتی ہے سڑک پر چلنے کے قوانین کا ذرا جو لحاظ رکھتے ہوں۔

تیسرے صاحب: نہیں صاحب میں نہیں مان سکتا، یہ بس ڈرائیور ہی بڑے لاپرواہ ہوتے ہیں روز کسی نہ کسی کی جان لیتے ہیں۔ مگر آپ کا یہ کہنا بھی حقیقت سے زیادہ دور نہیں ہے کہ راہ گیر راہ چلنے کے قوانین پر عمل نہیں کرتے۔ سڑک اور فٹ پاتھ میں کوئی تمیز ہی محسوس نہیں کرتے اب ایکسیڈنٹ نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا۔

دوسرے صاحب: آپ ٹھیک فرماتے ہیں، مگر یہ تو غور فرمایئے کہ آخر ڈرائیور حکومت کی مقرر کردہ رفتار سے تیز گاڑی چلاتے ہی کیوں ہیں، آپ جانتے ہیں یہاں کی فٹ پاتھ کس قدر تنگ ہیں، آبادی دن بدن

بڑھتی جارہی ہے، اب لوگ سڑک پر نہ چلیں تو کیا ہوا میں اُڑتے پھریں۔ ڈرائیوروں کو دیکھئے تو وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار نظر آتے ہیں نہ آگے کا ہوش نہ دائیں کی خبر نہ بائیں کی۔ مگر وہ غریب بھی مجبور ہیں۔ روزی کا معاملہ ہے، وہ بے چارے کریں بھی کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جس کی موت آنی ہوتی ہے ہزار بہانے بنا کر آتی ہے۔

تیسرے صاحب: دیکھئے ہم جائے حادثہ کے قریب پہنچ چکے ہیں، افوہ! یہاں تو بڑا زبردست ہجوم ہے۔ میرا خیال ہے وہ آدمی داعی اجل کو لبیک کہہ چکا ہے ورنہ صاحب اتنی بھیڑ ہرگز نہ ہوتی۔ اور دیکھئے تو شور کس قدر ہے، کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی معلوم ہوتا ہے کہ بیک وقت سب بول رہے ہیں۔

پہلے صاحب: حضرت مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔ اس قدر ہجوم ہے آپ ذرا اندر گھسنے کی کوشش کریں۔

تیسرے صاحب: ارے جناب اندر جا کر کیا کریں گے بڑی دھکم پیل ہے، یہیں سے دیکھئے ذرا جھک کر اس نیلی پتلون والے کی ٹانگوں کے بیچ میں سے، وہ بے چارہ اب تک بس کے نیچے دبا پڑا ہے۔

دوسرے صاحب: (چشمہ صاف کر کے آنکھوں پر جماتے ہوئے) ہاں اس کا دھڑ پہیئے کے نیچے دبا ہوا ہے، شاید ختم ہو گیا۔

پہلے صاحب: کیا کہا۔ . . . دھڑ پہیے کے نیچے آیا ہے . . . انا للہ وانا الیہ راجعون . . . میرا خیال ہے غریب کا سَر پاش پاش ہو کر رہ گیا ہو گا

دوسرے صاحب: خیال کی بھی ایک رہی۔ ارے صاحب آپ خود دیکھ لیجئے۔

پہلے صاحب: (خفت آمیز ہنسی کے ساتھ) حضت میری بینائی قدرے کمزور ہے ذرا دھندلا نظر آتا ہے۔

تیسرے صاحب: مگر خون نظر نہیں آرہا۔

دوسرے صاحب: واللہ آپ بھی کمال کرتے ہیں ذرا اس غریب کا جثہ تو ملاحظہ فرمایئے کیا اس بے چارے دبلے پتلے انسان کے سر میں اتنا خون ہو گا جو بس کے نیچے سے بہہ کر باہر آجائے۔

تیسرے صاحب: اوہو . . . ٹھیک . . . بالکل ٹھیک میں بھی تو کہوں آدمی بس کے نیچے آیا اور خون کا نام نہیں۔

پہلے صاحب: حضرت میرے تو اس منظر کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں

دوسرے صاحب: آپ کے تو رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں میں تو منظر دیکھ رہا ہوں، اور لرز رہا ہوں۔

تیسرے صاحب: اوہ ! . . . وہ دیکھیے . . . وہ اس کے پیر کے پاس کیا ہے۔

پہلے صاحب: مجھے تو کسی پھل کا چھلکا دکھائی دیتا ہے۔ غالباً کیلے کا ہے۔

تیسرے صاحب: یہی خبیث چھلکا اس بے چارے کی موت کا سبب بنا ہے

غالباً یوں ہوا کہ یہ سڑک پار کر رہا ہوگا اچانک بس آ گئی، اس کا پیر چھلکے سے رپٹا، یہ زمین پر گرا اور بس اس کے اوپر چڑھ گئی۔

پہلے صاحب: بالکل درست فرماتے ہیں۔ میں تو کہوں گا کہ سارا قصور سڑک پر چھلکا پھینکنے والے کا ہے نہ بس ڈرائیور کی غلطی ہے اور نہ اس غریب کی۔

دوسرے صاحب: آپ نے گویا میرے منہ کی بات چھین لی، نہ معلوم آج کے لوگوں میں کیا بیماری پھیل گئی ہے (پیک تھوک کر) کہ جو چیز کھائی اس کا چھلکا یا کاغذ سڑک پر ڈال کر چلتے بنے۔"

پہلے صاحب: اور حضرت غضب خدا کا۔ اگر ایسا کرنے والوں کو ٹوکئے تو اُلٹے سر ہو جاتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کا یہ فعل کسی سنگین حادثہ کا موجب ہو سکتا ہے۔

دوسرے صاحب: میرا بس چلے تو ایسا کرنے والوں کو تختۂ دار پر چڑھا دوں۔"

پہلے صاحب: اور اگر میں حاکم مقرر کیا جاؤں تو کالے پانی بھجوا دوں۔

تیسرے صاحب: خیر... خیر... آپ لوگ تو جذباتی ہو گئے، میرا خیال ہے کہ حکومت کو کوئی سزا تجویز کرنی چاہیے تاکہ آئندہ کے لئے ان کو تنبیہ ہو جائے

دوسرے صاحب: اس سے بہتر سزا اور کیا ہو سکتی ہے کہ پہلے اس سے وہ چیز اٹھا کر کوڑے کے ڈبے میں پھنکوائی جائے پھر اسے دس منٹ تک ایک ٹانگ پر

کھڑا رکھا جائے۔

تیسرے صاحب: نہیں جناب۔۔۔ مجھے آپ کی تجویز کردہ سزا سے اتفاق نہیں۔ اس سے تو اس کی بے عزتی ہوتی ہے۔۔۔۔ اگر ایسا کرنے والے پر بھاری جرمانہ کر دیا جائے تو کیسا رہے گا۔

پہلے صاحب: آہا! کیا بات ہے۔ واللہ طبیعت خوش ہو گئی اس سے بہتر سزا اور کیا ہو سکتی ہے۔

دوسرے صاحب: اوہو، حد ہو گئی۔ اب تک اس بے چارے کی لاش بس کے نیچے دبی پڑی ہے کسی کو اتنی توفیق نہیں کہ اس پر سے بس ہٹا کر اس کی لاش کو اس کے ورثا کے حوالے کر دے۔

تیسرے صاحب: میرا خیال ہے کہ ابھی تک اس کے کسی وارث کا پتہ نہیں چل سکا، ورنہ یہاں ایک آدھ فرد رزنا سسکتا ضرور موجود ہوتا۔

پہلے صاحب: اس بیچارے کو اس حالت میں دیکھ کر اس کی دکھیا بیوی کا کیا حال ہو گا معلوم نہیں اس کو تسلی و تشفی دینے کے لئے اس کا کوئی ہے بھی یا نہیں!

تیسرے صاحب: تسلی و تشفی تو ہوتی رہے گی مجھے تو پسماندگان کی فکر کھائے جا رہی ہے ان کے گزر اوقات کی کیا صورت ہو گی۔

پہلے صاحب: اب خدا ہی ان کا مددگار ہے، ایک یہ غریب تھا سو اللہ کو پیارا ہو ار

دوسرے صاحب: صاحب میں تو کہوں گا، حکومت کو اس قسم کے کاموں کے لئے
ایک امدادی فنڈ کھول دینا چاہیئے۔

پہلے صاحب: مگر حضرت..... حکومت کیا کیا کرے،..... ہمارا بھی تو کچھ
فرض ہے کیوں نہ ہم اسی وقت اس کے پسماندگان کے لئے چندہ جمع
کرنا شروع کر دیں، اپنی محنت نکال کر باقی ان کے حوالے کر دیں گے۔

تیسرے صاحب: بڑا نیک کام ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ لوگ ہمیں بے ایمان
تصور کریں گے ان کو بھلا ہمارے دل کا حال کیا معلوم، وہ تو سمجھیں گے
کہ ہم اس کے لئے چندہ جمع کر کے خود ہی ہضم کر جائیں گے۔

پہلے صاحب: استغفراللہ، لعنت ہے، اس پر جو ایسا سوچے بھی، کیا ہم شکل سے
بے ایمان معلوم ہوتے ہیں۔

دوسرے صاحب: توبہ کیجیے مگر دنیا تو یہی سمجھتی ہے کہ آج کل لوگ شریف انسانوں
کا روپ دھارے دھوکا دیتے پھرتے ہیں۔

پہلے صاحب: پھر تو میں آپ کی اس تجویز کی تائید کروں گا حکومت ہی کو اس
سلسلہ میں کچھ کرنا چاہیئے۔

تیسرے صاحب: لیکن جناب اس فنڈ سے ہر کوئی تو امداد وصول نہیں کر سکتا اس امداد
کے تو صرف غرباء ہی مستحق ہوں گے۔

پہلے صاحب: کون جانے یہ بے چارا غریب تھا یا امیر۔

دوسرے صاحب: اجی یہ پتہ لگانا بھی کوئی مشکل ہے، میں ابھی بتائے دیتا ہوں
وہ دیکھئے اس کی پتلون . . . . . . خاکی رنگ کی میلی میلی سی . . . . .
اس پر جا بجا کالے دھبّے بھی پڑے ہوئے ہیں۔ غالباً کسی کارخانہ
میں ملازم تھا۔ ظاہر ہے متمول طبقہ سے تعلق نہیں رکھتا ہوگا۔

پہلے صاحب: تو حضرت اس کا یہ مطلب ہوا، اس کے پسماندگان اس فنڈ
سے امداد حاصل کرنے کے صد فیصد مستحق ہیں۔

تیسرے صاحب: مگر جناب ایسے کسی فنڈ کا ہمارے یہاں نام و نشان ہی نہیں ہے
آپ تو ہوائی قلعہ تعمیر کر رہے ہیں۔

پہلے صاحب: اب نہیں ہے تو کیا ہوا، ہو جائے گا۔ اس جیسے غریب آئے دن
مرتے ہی رہتے ہیں۔ اس کی موت سے کم از کم یہ فائدہ تو ہوا کہ ہم اس
قسم کے فنڈ کی ضرورت محسوس کرنے لگے۔ حضرت میرا خیال ہے کہ فنڈ
کا نام اس آدمی کے نام پر رکھ دیا جائے۔

تیسرے صاحب: لیکن اس سے اس کے پسماندگان کو کیا فائدہ حاصل ہوگا۔

پہلے صاحب: اس فنڈ سے اس کے پسماندگان کی ماہانہ امداد باندھ دی جائے
تاکہ اس کے بچے تعلیم حاصل کر کے کسی قابل بن جائیں۔

دوسرے صاحب: یہی میں چاہتا تھا . . . . . سمجھ میں نہیں آتا لوگ اس قدر بے حس
کیوں ہو گئے ہیں۔ ذرا دیکھئے تو سہی . . . . وہ اب تک بس کے نیچے

دبا پڑا ہے۔ اگر کوئی پولیس والا آنکلا تو لاش کو پوسٹ مارٹم سے کوئی
نہیں بچا سکے گا

پہلے صاحب: آپ بالکل درست فرما رہے ہیں میں ابھی ان لوگوں کو سمجھاتا ہوں
کم بختوں کے ضمیر نہ جانے کہاں مر گئے۔ تماشہ بنا رکھا ہے اس بے چارے
کا (آگے بڑھ کر) کیوں صاحب لاش کو بس کے نیچے سے نکال لینے میں
کیا قباحت ہے۔

ایک آدمی: کیسی لاش..... کس کی لاش... آپ کے حواس تو بجا
ہیں..؟

پہلے صاحب: آپ کی بصیرت کیا ہوئی۔ آپ کو اتنی لمبی چوڑی لاش نظر
نہیں آتی۔

وہ آدمی: حضرت آپ کا سر تو شانوں پر موجود ہے..... یہ لاش
نہیں ہے۔

پہلے صاحب: لاش نہیں ہے تو کیا آپ لوگ کپڑے کا پتلا بنا کر اس کی پوجا
کر رہے ہیں۔

وہ آدمی: ارے صاحب یہ آدمی بس کا ڈرائیور ہے اچانک راستہ میں
بس میں کچھ خرابی ہو گئی۔ اب یہ نیچے لیٹا اسے ٹھیک کر رہا ہے کچھ لوگ
بس کے مسافر ہیں جو بس ٹھیک ہونے کے منتظر ہیں اور کچھ راہ گیر ہیں،

جو دریافت حالی اور تجسس کے لئے جمع ہیں۔ . . . سمجھے آپ۔

پہلے صاحب! جی ــــ کیا فرمایا آپ نے ــــ یہ لاش نہیں ہے بس کا ڈرائیور ہے ــــ بس ٹھیک کر رہا ہے ــــ بہت اچھا ــــ بہت خوب خدا مبارک کرے ــــ خدا آپ کو منزل مقصود پر پہونچائے ــــ

اچھا ــــ آداب عرض ــــ خدا حافظ۔

(ستمبر ۱۹۶۶ء)